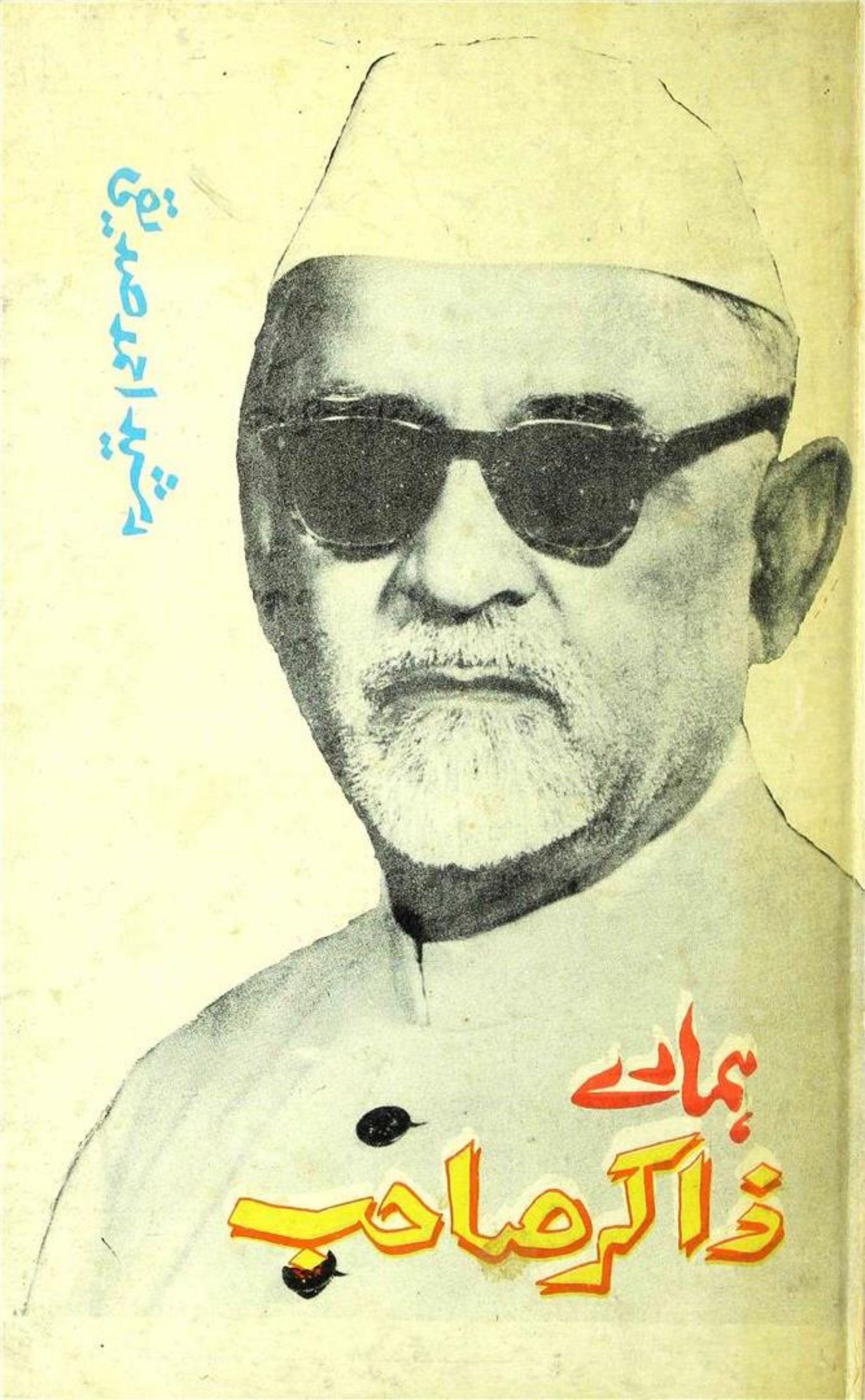

ہمارے ذاکر صاحب

رشید احمد صدیقی

ہمارے ذاکر صاحب

رشید احمد صدیقی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

© رشید احمد صدیقی

صدر دفتر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دلّی ۱۱۰۰۲۵

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار دہلی ۱۱۰۰۰۶

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

اگست ۱۹۷۳ء

(کوہ نور پرنٹنگ پریس۔ دلّی)

فہرست مضامین

۱۔ ذاکر صاحب ۵

۲۔ مرشد ۶۱

۳۔ موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال ۷۱

۴۔ ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے ۱۲۳

ذاکر صاحب

ذاکر صاحب کی آنکھ میں شدید تکلیف تھی۔ علاج کے لیے بمبئی جا رہے تھے۔ دہلی کے اسٹیشن پر خدا حافظ کہنے کے لیے میں بھی موجود تھا، گاڑی روانہ ہوئی تو دل بھر آیا۔ طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوئے انسانی فطرت کو آڑے وقت تنکے تک کا سہارا ڈھونڈھ لینے کا عجب ملکہ ہے۔ مجھے بھی آس پاس ہی سہارے مل گئے۔ میں نے خیال کیا بھوک لگی ہے، جوتا نیا بھی ہے اور تنگ بھی۔ دن بھر دلی کی خاک چھانتا پھرا ہوں۔ کسی نے خلاصۂ موجودات سمجھنا تو درکنار "ہر مال چھ پیسے" سے بھی مخاطب نہ کیا۔ ممکن ہے یہی باتیں دل پر اثر انداز ہوئی ہوں۔ ساتھ ہی یہ خدشہ بھی پیدا ہوا کہ کہیں یہی تحت شعور میں پہنچ کر گل نہ کھلائیں پاس کی ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ پہلو میں ایک گنوار نگروٹ اپنے پاؤں ہاتھوں کے حلقہ میں لیے ہوئے اس طرح بیزار بیٹھا ہوا تھا جیسے سوچ رہا ہو کہ نہ لڑائی ختم ہوتی ہے نہ زمینداری۔ "ولندیزی" قسم کے جوتے منھ کھولے ہوئے سامنے پڑے تھے۔ میں نے گنوار کی نظر بچا کر اس کے جوتوں پر توجہ ڈالی تو معلوم ہوا کہ جوتے کو گنوار کے پاؤں سے جو صدمے پہنچے تھے وہ آسام اور برما کے روڑے کانٹوں اور حشرات الارض سے نہ پہنچے تھے ان کی ہمدردی میں میں نے بھی اپنے پاؤں سے جوتے موزے علیحدہ کیے تو معلوم ہوا کہ ناخن گوشت سے جدا ہو گیا ہے۔ لیکن انگشت حنائی" کا دور دور تک پتہ نہیں۔ فیتے جوتے سے علیحدہ کر کے جیب میں رکھے، جوتے پھر سے پہنے اور علی گڑھ جانے والی گاڑی کی فکر میں روانہ ہوا،

گاڑی تیار تھی۔ دو کیلے خریدے، چند دھکے کھائے۔ پلیٹ فارم پر داخل ہونے اور گاڑی پر سفر کرنے کے علیحدہ علیحدہ دو ٹکٹ تو پہلے سے تھے ہی ان کے علاوہ لڑائی کے اعزاز میں داخل ہونے کے لیے لات مکے اور بہت سارے منتر از قسم گالی گلوج مقرر کر دیے گئے تھے۔ جن کے بغیر آپ نہ ڈبے میں داخل ہو سکتے ہیں نہ اپنی نشست محفوظ رکھ سکتے تھے گاڑی میں بیٹھ کر اونگھنے لگا اور ایسا معلوم ہوا جیسے محوری طاقتیں قیدیوں کو موت کے ڈبے میں نہیں بلکہ نزع کے ڈبے میں لیے جا رہی ہیں علی گڑھ کے اسٹیشن پر گاڑی دھچکے سے رکی سامنے یونیورسٹی پر اکڑ کے نمائندے کھڑے تھے۔ فرمایا آج تانگے نہیں مل رہے ہیں۔ میں ان سے بغل گیر ہو گیا اور روندے جانے اور روپڑنے سے بچ گیا۔

دوسرے دن ایک عزیز دوست کو ذاکر صاحب کی دلّی سے روانگی اور اپنے متاثر ہونے کا حال لکھا اور ضمناً یہ بھی لکھ گیا کہ یہ تو ذاکر صاحب کا بمبئی کا سفر تھا جب دل کا یہ حال ہوا۔ خدا نخواستہ آخری مفارقت پیش آئی اور میں موجود ہوا تو کیا عالم ہوگا۔ دوست نے اس خط کا جواب خلاف معمول جلد دیا اور لکھا۔

"رشید صاحب آپ بالکل نہ گھبرائیں ایک امید یہ بھی تو ہے جس پر کہا جاتا ہے دنیا قائم ہے، کہ آپ ذاکر صاحب سے پہلے رحلت فرمائیں اور اس طور پر آپ کو وہ دن دیکھنا نہ نصیب ہو جس کا آپ کو اندیشہ ہے۔"

میں دوست کی اس برجستہ گوئی پر جھوم گیا لیکن دل میں ٹھان لی کہ آئندہ تاحیات فریقین ان دوست سے اس قسم کے ازغیبی مسائل پر بالکل گفتگو نہ کی جائے گی۔

گذشتہ اکتوبر میں حکومت ہند کی طرف سے کچھ ماہرین تعلیم ایک تعلیمی کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن جانے والے تھے ان میں ذاکر صاحب بھی تھے۔ روانگی سے

کچھ پہلے علی گڑھ تشریف لائے۔ ایک دن کھا پی کر، پاؤں پھیلا کر، نیم غنودگی کی حالت میں قوم کے بخت بیدار پر گفتگو شروع ہونے والی تھی کہ مونگ پھلی والے نے آواز دی، مرشد نے خواب آلود لہجہ میں جواب دیا۔

"مزا سردی کا"

میں نے کہا "یہ کیا؟ فرمایا مونگ پھلی ہندوستان کا بادام ہے"۔

میں نے کہا "پھر؟"

فرمایا، "پھر کیا میں نے تو "جنرل نالج" (معلومات عامہ) کی بنا پر ایک بات بتا دی"!

مونگ پھلی والا بلایا گیا تو بڈھا خوانچہ والا ہم دونوں کا قدیم مہربان نکلا ۲۰-۲۱ء میں میں اور ذاکر صاحب، صاحب باغ (ایم۔ اے۔ او کالج) میں رہتے تھے اور یہ کیلے سیب، سنترے بیچنے لایا کرتا تھا۔ ذاکر صاحب شکوہ کرتے تو کہتا میاں گلے ہوئے نہیں ہیں مربے کے سیب ہیں۔ صرف آپ کے لیے بچا لیا کرتا ہوں۔

مرشد نے کہا "کیوں بھئی وہ مربے والے سیب بھی بیچتے ہو یا نہیں"۔

بڈھا ہنس پڑا، پھر ایک آہ سرد کھینچ کر بولا۔ "میاں کیا پوچھتے ہو۔ کالج بدل گیا۔ اب ویسے لڑکے نہ آئیں گے"۔

ذاکر صاحب نے پوچھا "کیا بات ہوئی۔؟"

بڈھے نے کہا۔ "میاں نفع نقصان کا ذکر کیا یہ تو روزگار کے ساتھ لگا ہی رہتا ہے لیکن لڑکوں میں اب وہ بات نہ رہی"۔

میں نے پوچھا "آخر وہ کونسی بات تھی؟" بڈھا بڑا گھٹا ہوا تھا، کھلا نہیں، ٹال کر بولا۔ "بس میاں وہ بات نہیں رہی!" میں نے اور چھیڑا تو جھنجھلا گیا۔ بولا "پہلے کسی کی مجال تھی کہ کالج میں مونگ پھلی بیچنے لاتا!"

میں اور ذاکر صاحب دونوں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے!

بڈھا سمجھا ہم دونوں دام کی طرف سے فکر مند ہیں۔ بولا "میاں، دام کی فکر مت کیجیے، میں نے ذاکر صاحب سے بڑے پیسے کمائے ہیں اب ان سے دام نہ لوں گا۔ اللہ ان کو خوش رکھے اور چلا گیا۔!

اسی زمانہ قیام میں مکان کے بیرونی احاطے میں ہم دونوں ٹہل رہے تھے ایک طرف آلوؤں کی کیاری تھی، سامنے بھینس بندھی ہوئی تھی، میں آلو کے مزے پر اور ذاکر صاحب بھینس کے اطوار پر گفتگو کر رہے تھے۔

میں نے کہا "ذاکر صاحب آپ لندن جا رہے ہیں ایک چیز میرے لیے لیتے آیئے گا۔

بولے "وہ تو ضرور لاؤں گا۔"

میں نے کہا "کیا؟"

فرمایا "گلاب۔"

میں بھڑک گیا اور بولا "مرشد آپ کی انہی باتوں سے تو میں اب تک ..... کا ممبر نہیں بن سکا ہوں۔"

فرمایا "اس میں کیا شک ہے۔ میں گلاب لایا اور آپ نے انڈین نیشنل آرمی میں بھرتی ہونے کی عرضی دی۔"

میں نے کہا "مرشد دیکھیے انڈین نیشنل آرمی کا مقدمہ زیر سماعت ہے دشمنوں کے کان بہرے، معلوم نہیں کیا افتاد پڑے پھر آپ ہی بھاگے بھاگے پھریں گے۔"

مرشد نے کہا "یہ کیوں؟"

میں نے کہا "بات یہ ہے کہ میں پکڑ جاؤں گا تو آپ اسے قومی حادثہ سے تعبیر کریں گے، میری تصویر چھپے گی آپ کا پیغام شائع ہوگا۔"

بولے "یہ کچھ نہ ہوگا"

میں نے کہا "ہوگا۔ کیوں نہیں یہ بھی تو ممکن ہے کہ تصویر کے نیچے آپ کا نام ہو اور

پیغام کے نیچے میرا ــــ دیکھیے میرے گلاب نہ بھولیے گا۔"

ذاکر صاحب لندن سے واپس آئے اور گلاب بھی لائے جس نے سنا تعجب کیا لیکن کوئی طے نہ کر سکا کہ اس میں بے تکا کون تھا فرمایش کرنے والا یا فرمایش لانے والا ذاکر صاحب سے ان کے سارے دوستوں نے بڑی تاکید کر دی تھی کہ وہ لندن کے مشہور ماہرین فن سے اپنی صحت کے بارے میں ضرور مشورہ کرتے آئیں جس کی ان کو ضرورت تھی مجھے خاص طور پر اس کی خوشی تھی کہ اس کام کے سلسلے میں ذاکر صاحب کو اپنی صحت درست کرنے کا موقع مل جائے گا۔ اور چند ہفتے کے لیے ان کو یہاں کے بے پایاں مناقشوں اور مصروفیتوں سے نجات مل جائے گی۔

لیکن ہوا یہ کہ وہ کسی ڈاکٹر سے مشورہ نہ کر سکے صرف گلاب لائے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس کمیٹی میں ذاکر صاحب ہوتے ہیں اس کے سارے ممبروں سے زیادہ وہ کام خود کرتے ہیں اور بیشتر اراکین یا تو سفر خرچ وصول کرتے ہیں یا انٹرویو دیتے ہیں یا اسٹیشنری پر سابق ممبر فلاں کمیٹی چھپواتے ہیں۔ لندن کے واپسی کے بعد سے اب تک میں ذاکر صاحب سے مل نہ سکا لیکن مجھے اندازہ ہے کہ وہ کمیٹی کانفرنس، دید و بازدید کے کاموں میں کیسے پھنسے رہے ہوں گے اور گلابوں کے حاصل کرنے اور لانے کی داستان کیا ہے۔ ان کے لانے میں کتنے اور کیسے کیسے مہمل یا دلچسپ مراحل پیش آتے ہوں گے اور ذاکر صاحب نے اپنی ذکاوت معصومیت اور مستقل مزاجی سے کس کس کو کس طرح زیر یا رام کیا ہوگا۔

یہی فرمایش میں نے کسی اور سے کی ہوتی تو وہ مجھے خوش کرنے یا اپنے ذوق کی میرے ذوق پر فضیلت جتانے کے لیے مجھ سے مزاح فرماتے یا ایک لمحے کے لیے چہرہ ایسا بنا لیتے جیسے اس پر "خدا ملک معظم کو سلامت رکھے" کا ترانہ بج رہا ہے یا پھر فرماتے "دیکھیے اللہ تعالیٰ ہندوستان کی آبرو رکھ لے۔ اس مہم پر جانا پل صراط پر چلنے سے کم نہیں"۔ اس کے بعد

وعدہ کر لیتے کہ فرمائش ضرور ضرور پوری کریں گے لیکن واپس آنے پر ملاقات ہوتی تو جھپٹ کر بغل گیر ہو جاتے گردن یا آس پاس کا بوسہ لے کر رونی صورت بنا کر فرماتے "رشید صاحب کیا بتاؤں لندن پہنچتے ہی بیمار ہو گیا، ہارلی اسٹریٹ کا فلاں مشہور ماہر امراض روح قبض کرنے کے لیے بلایا گیا۔ فلاں ارل اور ڈیوک اور انجمن دشت قبچاق کے سکریٹری تجہیز و تکفین کے لیے آ گئے تھے۔ یا کاموں میں ایسا پھنسا کہ مرنے کی مہلت نہ ملی۔ آج اس وزیر کا مہمان، کل اس خواجہ سرا کا میزبان، فلاں نامہ نگار کو انٹرویو دیا، فلاں ایڈیٹر کے ٹیلیفون آئے۔ لندن کی تمام لڑکیاں طرح طرح کے پھول میرے سینے پر نصب کرنے کے لیے میرے کمرہ کی کھڑکی کے نیچے قطار باندھے تمام رات "دست فشاں و پائے کوباں" ادھر میں ہندوستان کے غم میں ترساں و لرزاں، یہ احباب کی دعاؤں کا اثر تھا کہ کامیاب و کامراں واپس ہوا۔ گلاب کے لیے میں نے وزیر ہند کو ٹیلیفون کیا، انھوں نے واشنگٹن کو واشنگٹن نے اسکو رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ جب تک کامریڈ اسٹالن تعطیل سے فارغ ہو کر ماسکو واپس نہ آ جائیں اٹم بم اور گلاب کے مسئلہ پر گفتگو معرض التوا میں رہے گی۔" پھر بڑے چاؤ سے فرماتے "رشید صاحب آپ کو آخر لندن سے گلاب منگانے کا کیا خبط سمایا میرے باغ میں صدہا گلاب ہیں جن کا میری بیوی بہترین گلقند تیار کرتی ہیں آپ کو جتنے درختوں کی ضرورت ہو منگا لیجیے۔" اب ان سے کون کہے کہ مجھے نہ گلقند کے گلاب چاہئیں اور نہ گلقندی بیوی!

گلاب لانے کا واقعہ ذاکر صاحب کی سیرت و شخصیت کو پورے طور پر منقح و منور کرتا ہے۔ گلاب پانے کی جو خوشی مجھے ہوئی اس کا اظہار کچھ ایسا ضروری نہیں۔ البتہ ذاکر صاحب کا ان گلابوں کا لانا بجائے خود ایک مطالعہ ہے دلکش بھی اور اہم بھی۔ اس کی دلکشی اور اہمیت صرف ایسے لوگوں کی سمجھ میں آ سکتی ہے جو زندگی کے نعائم و فضائل کے قائل ہیں نہ کہ اس کے ذمائم و رذائل کے۔ میں دوست کے فضائل پر مرتا ہوں۔ نہ کہ اس کے اقتدار و اختیار پر۔ اس لیے کہ اثر و اقتدار حاصل کرنے کے بہت سے ذرائع

ہیں۔ جن کو سخت مذموم طریقوں سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یا جن کے حصول میں محض اتفاق کو دخل ہو سکتا ہے لیکن فضائل نفس وہ نعمت ہے جو صرف خدا کے برگزیدہ بندوں کو ملتی ہے ذاکر صاحب نے کبھی اثر و اقتدار کے حصول کی کوشش نہ کی۔ اثر و اقتدار البتہ برابر اس کی کوشش کرتے رہے (مجھے ایک ایک کا علم ہے) کہ ذاکر صاحب ان کو قبول کر لیں لیکن انھوں نے کبھی ان کی طرف توجہ نہ کی۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس میں ذاکر صاحب کو اپنے نفس کے زیر کرنے میں کوئی زحمت نہ اٹھانی پڑی ہوگی۔ جس طرح ریڈیو سیٹ میں صرف مقررہ مخصوص لہریں بار پاتی ہیں اور دوسری تمام لہریں اس سٹ کے لیے بے کار ثابت ہوتی ہیں ٹھیک اسی طرح اچھے اور برگزیدہ انسان کے دل کے تاروں کو وہی خیالات و جذبات مرتعش کر سکتے ہیں جو خود اچھے اور برگزیدہ ہوں۔ یہی مثال ان لوگوں پر صادق آتی ہے جن کی فطرت میں ازل سے ٹیڑھ چلی آتی ہے۔ وہ صرف اس وقت اپنے زندہ ہونے کو محسوس کرتے ہیں جب ان پر شیطانی پر تو پڑ رہا ہو۔ میں ایسے لوگوں سے واقف ہوں جو انسانیت و انصاف سے متاثر ہو کر بھی کام کریں گے تو اس میں کہیں کہیں کوئی کھوٹ یا نجاست ضرور ملا دیں گے۔ یہاں میں قطعاً مبالغہ سے کام نہیں لے رہا ہوں۔

عرصہ ہوا ایک بار رنگون جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک دوکان پر کھجور خریدنے گیا کھجوریں ناقص تھیں، دوکاندار نے کہا کہ ٹھہریے اندر سے، لاتا ہوں وہاں سے نہایت عمدہ کھجوریں لا کر دیں۔ میں نے تعجب میں آکر پوچھا بہتر مال فروخت کرنے کے لیے کھلی دوکان میں کیوں نہیں رکھتے، اس نے جواب دیا کہ یہاں کے بیشتر خریدار تازہ عمدہ کھجوریں نہیں خریدتے۔ یہ اس وقت خریدتے ہیں جب ان میں کیڑے پڑنے لگتے ہیں! اس سلسلے میں ضمناً ایک اور لطیفہ سن لیجئے۔ کلکتہ کی دکان پر ایک چیز کے دام پوچھے دوکاندار نے جو قیمت بتائی وہ ٹھیک ہو یا نہ ہو، میرے بوتے کی نہ تھی۔ میں نے مزید گفتگو کی تو اس نے ہنس کر کہا "تو پھر آپ اس کے منتظر ہیں کہ اسے اس وقت خریدیں جب اس کے دام بڑھ جائیں" اس

سوال سے میں خفیف تو ہوا لیکن یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا کہ "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس وقت میں خریدار کی حیثیت سے نہیں، چور کی حیثیت سے حاضر ہوں۔!"

ذاکر صاحب کے جاننے والے جانتے ہیں کہ کوئی بڑا آدمی ان سے یہ فرمایش کرتا کہ موقع اچھا ہے لندن میں میرے لیے کوئی اراضی خرید لینا یا ملک معظم کی خدمت میں میرا یہ خط پہنچا دینا تو ذاکر صاحب اس خط کو گم نہ کرتے تو لاکر واپس ضرور کر دیتے اور لندن میں اس فلاکت اور تباہی کے زمانے میں کسی کا گھر خریدنے کے بجائے ایک آدھ دن اس کے گھر کی مرمت کے سلسلے میں مزدوروں کے ساتھ کام کرتے لیکن اگر ان کا کوئی معمولی دوست یہ فرمایش کر دیتا کہ میرے لیے ایک مرغی لیتے آئیے گا تو وہ یقیناً مرغی بغل میں دابے ہوئے قصر مکنگھم سے گزرتے اکابر پارلیمنٹ اور "لویانِ شوخ و شنگ" سے بے جھجک ہنستے بولتے خدا حافظ کہتے ہوئے ریل یا ہوائی جہاز کے اسٹیشن پر پہنچ جاتے!

ذاکر صاحب ان لوگوں میں ہیں جو اس کے قائل ہیں کہ بڑائی اٹم بم کی اجارہ داری میں اتنی نہیں ہے جتنی مرغی سے شرمندہ نہ ہونے میں ہے۔

گلاب کا لانا بظاہر ایک معمولی سی بات ہے لیکن اس کی تہہ میں ذاکر صاحب کی بے بہا سیرت کا موتی تارے کی طرح دمکتا نظر آتا ہے ایک دوست کی معمولی سی فرمایش پوری کر دینے کے لیے بڑی سے بڑی دشواریاں اٹھانے کا ایک مخصوص سرور ہوتا ہے جس سے آشنا ہونا ہر ایک کا مقدر نہیں۔ مجھے گلاب پانے کی بڑی خوشی ہوئی گو یہ فرمایش کسی اور نے پوری کی ہوتی تو بھی خوشی ہوتی لیکن ذاکر صاحب کا بیچ میں ہونا میری خوشی کا خاص طور پر موجب ہوا، اس کے وجوہ ہیں، اول تو یہ کہ میں زندگی کی اچھی اور بڑی قدروں کی تعبیر افسانے کے کرداروں سے نہیں اپنے احباب بالخصوص ذاکر صاحب کے اطوار سے کرتا ہوں اور جب اور جہاں کہیں اس کی تصدیق ہوتی ہے تو میں اپنے آپ کو داد دیتا ہوں کہ میں بڑی بات اور بڑے آدمی کو پہچانتا ہوں اور اس کی قدر کرتا ہوں۔ اس لیے

مجھے طفیلیوں، چوروں یا غاصبوں کی طرح نہیں بلکہ ایک انسانیت کی حیثیت سے سوسائٹی میں جگہ پانے کا حق حاصل ہے۔ دوسرے یہ کہ میں اس پر عقیدہ رکھتا ہوں کہ دنیا میں کوئی بڑے سے بڑا واقعہ ایسا نہیں ہوا جو ہماری روزمرّہ کی زندگی میں ہر شخص کے لیے رونما نہ ہوتا ہو یعنی ہر شخص ہر لمحہ تاریخی ہیروؤں کی آزمایش سے گزرتا رہتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے میرے دل میں یہ بات بیٹھ سی گئی ہے کہ اگر خدا ویسا ہی ہے جیسا میں نے سمجھا ہے تو حشر کے دن ہم میں سے بہتوں کو یہ دیکھ کر سخت حیرانی ہوگی کہ ہم نے کس کو کہاں پایا اور بڑی سے بڑی منزلت والوں کی صف میں جن کے کارناموں سے دنیا کا چپّہ چپّہ گونج رہا ہے، ایسے لوگ بھی شامل ہیں جن سے شاید ان کے محلّے والے بھی پورے طور پر واقف نہ تھے۔

ایک موقع پر مجھے ذاکر صاحب کے اعزاز میں تقریر کرنی پڑی میں نے تھوڑی دیر تک یہ سوچا کہ اس پچیس تیس سال میں ذاکر صاحب کی کون سی بات مجھے سب سے زیادہ ممتاز نظر آئی، فی الفور میرے ذہن میں یہ آیا کہ ذاکر صاحب نے طالبعلمی کے زمانے سے لے کر آج تک کوئی کام ایسا نہیں کیا جو دوسرے درجہ کا ہو۔ تیسرے درجہ کا تو سوال ہی نہیں۔!

ذاکر صاحب علی گڑھ کے طالب علم تھے، نان کوآپریشن میں وہاں سے علیحدہ ہوئے اور جرمنی چلے گئے، وہاں سے آکر جامعہ کا کام سنبھالا اور کس کس طرح اس کو سنوارا اس زمانے میں ان پر اور ان کے ساتھیوں پر کیا گزری، اس کی داستان بڑی طویل ہے۔ اس کا اندازہ ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے۔ کئی سال ہوئے دولت آصفیہ سے جامعہ کو گراں قدر مالی امداد ملی۔ ذاکر صاحب سے علی گڑھ میں ملاقات ہوئی۔ میں نے مبارکباد دی تو بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے۔ "رشید صاحب آج گیارہ سال بعد جامعہ کے اسٹاف کو پوری تنخواہ دی جا سکی!" میں متحیر رہ گیا۔ میں نے

کہا" ذاکر صاحب یہ واقعہ جامعہ کی تاریخ میں نہیں ہماری تمام قومی تحریکوں میں یاد رکھا جائے گا۔ جہاں ایسے کام کرنے والے ہوں وہاں میرا گذر تو نہیں ہو سکتا لیکن کسی دن ریڈیو پر تقریر کرنے دہلی آیا تو دو رکعت نفل پڑھنے جامعہ نگر ضرور جاؤں گا۔"

نان کو آپریشن کی زد میں علی گڑھ ہی کا ایک حصہ ٹوٹ کر جامعہ بنا۔ "چشم زلیخا" کو "نور دیدۂ یعقوب" ہی روشن کیے ہوئے ہے۔ اس زمانے کے بیشتر بہترین طالبعلم بھی علی گڑھ سے نکل کر جامعہ میں شامل ہو گئے۔ لیکن جامعہ کو موجودہ شکل، حیثیت اور شہرت دینے کا سہرا تمام تر ذاکر صاحب اور ان کے بے لوث رفقا کے سر ہے، علی گڑھ کے بعض لوگوں کی نظر میں جامعہ کا قیام ایک حریف ادارہ کی حیثیت سے کچھ دنوں کھٹکا یہ بدگمانی رفتہ رفتہ دور ہو گئی۔ لیکن جیسا کہ ہمارے ذہن و اخلاق کا مذموم خاصہ ہے ہم ہر تحریک کو اکثر اپنے ذاتی محدود مشتبہ اغراض و مقاصد کی روشنی میں دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ذاکر صاحب اور ان کے رفقاء کی طرف سے علی گڑھ کا ایک مخصوص طبقہ بدگمان رہا اور اب بھی ہے۔

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں اس بدگمانی کے باوجود جو عناد کی حد تک پہنچی ذاکر صاحب علی گڑھ کے ہر انتظام میں شروع سے آخر تک شریک رہے محض ضابطہ کی رو سے نہیں بلکہ انہوں نے انتہائی خلوص، تندہی، قابلیت اور ہمدردی کے ساتھ یونیورسٹی کے نازک سے نازک اور پیچیدہ سے پیچیدہ معاملہ میں حصہ لیا۔ اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ انھوں نے نادانستہ طور پر بھی کبھی کوئی ایسا کام نہ کیا جو علی گڑھ کے حقیقی مسائل کے ذرہ برابر بھی منافی ہوتا ان کا بدترین دشمن بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ذاکر صاحب نے علی گڑھ کی انتظامی دردبست سے گہرا اور اہم تعلق رکھتے ہوئے بھی کسی معاملہ میں اپنے خیال، الفاظ یا عمل سے کوئی بات ایسی کی ہو جس سے علی گڑھ کے نام پر حرف آتا ہو۔ یہی نہیں بلکہ جماعت منتظمہ میں جب تک وہ شریک رہے دوست

اور دشمن دونوں کو اطمینان رہا کہ کوئی ایسی بات نہ ہوگی جو انصاف یا ہمدردی سے بعید ہو، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ ستم ظریفی بھی دیدنی ہے کہ جس معاملہ میں ذاکر صاحب کو قومی پیمانہ پر سب سے زیادہ رسوا کیا گیا اسی معاملہ میں رسوا کرنے والے ذاتی اور خفیہ طور پر ذاکر صاحب کی رہنمائی اور ہمدردی کے ملتجی دیکھے اور پائے گئے!

جرمنی سے واپس آنے کے بعد سے آج سے چند سال پیشتر تک ذاکر صاحب مسلم یونیورسٹی کورٹ، اکزیکٹو کونسل، اکیڈمک کونسل اور شعبۂ اقتصادیات کے ممبر رہے۔ ان تمام اداروں میں جب کبھی کوئی کمیٹی کسی مسئلے سے متعلق بنائی گئی ذاکر صاحب کا نام ممبری کے لیے سب سے پہلے پیش کیا جاتا اور بے چون وچرا بڑی خوشدلی اور اعتماد کے ساتھ قبول کر لیا جاتا، سالہا سال وہ مسلم یونیورسٹی کے انتظامی معاملات میں شریک کار رہے۔ بیرونی اشخاص کے ممبر ہونے کی جہاں کہیں ضرورت ہوئی ذاکر صاحب ضرور شریک کیے گئے۔ اور ایک متنفس بھی ایسا نہیں ہے جس نے ذاکر صاحب کی معاملہ فہمی، خلوص اور قطعاً بے لوث ہونے کا اعتراف نہ کیا ہو۔!

تمام واقعات دہرانے کا یہ موقع نہیں ہے صرف دو ایک کا تذکرہ کر دینا کافی ہے۔ مسلم یونیورسٹی میں ایک تحریک یہ پیش ہوئی کہ جماعت اساتذہ میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جن کے عقائد مذہبی قابل گرفت ہیں۔ اس تحریک میں جو پیچیدگی اور نزاکت تھی اس کا اثر اسٹاف کے طبائع پر بالعموم جو کچھ پڑ سکتا تھا اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اکزکٹو کونسل میں یہ مسئلہ پیش ہوا۔ سر سلیمان مرحوم وائس چانسلر تھے کونسل میں جو تقریریں ہوئیں، ان میں جوش، قابلیت، قانون دانی، بیزاری، مایوسی غرضیکہ ہر طرح کے جذبات کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا مسئلہ کی نوعیت یہ تھی کہ ہر مسلمان ممبر اسٹاف سے ایک تحریر لی جائے کہ وہ مذہبی عقائد اور اسلامی روایات کا احترام کرے گا لیکن سوال یہ تھا کہ اس تحریر کا مضمون کیا ہو! جب بحث نے طوالت اختیار

کی تو سر سلیمان مرحوم نے ذاکر صاحب سے فرمایا، "ڈاکٹر صاحب آپ نے تو ساری بحث سن لی اب کوئی فارمولا ایسا وضع کیجیے جس پر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اتفاق ہو جائے"۔ ذاکر صاحب نے فی الفور ایک مختصر سا مسودہ تیار کر کے مرحوم کی خدمت میں پیش کر کے حاضرین کو سنا دیا۔ بغیر کسی مزید گفتگو کے ہر شخص نے اسے قبول کر لیا، اس میں وہ لوگ بھی تھے جو اس تحریک کی موافقت میں سر بکف تھے۔ اور وہ بھی تھے جو اس کی مخالفت میں شمشیر برہنہ۔ یہ مسئلہ اس تحریر سے ایسا ہموار ہوا کہ پھر کبھی اس کی کوئی شق معرض بحث میں نہ آئی۔

اسٹاف اور جماعت منتظمہ میں سر سلیمان مرحوم ہی کے زمانے میں ایک مسئلہ یہ پیش ہوا کہ یونیورسٹی کی تعطیلیں متعین کرنے کا اختیار اکیڈمک کونسل کو تھا کہ اکزکٹو کو اس بحث نے بھی ناخوشگوار فضا پیدا کی اور فریقین میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو دونوں کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے پر آمادہ ہوتا یا اس کی آمادگی نتیجہ خیز ثابت ہوتی سر سلیمان مرحوم نے ذاکر صاحب سے فرمائش کی کہ وہ اسٹاف سے گفتگو کر کے مفاہمت کی کوئی صورت نکالیں۔ چنانچہ ذاکر صاحب نے اراکین اسٹاف سے گفتگو کر کے اس گتھی کو سلجھایا۔ ایک صاحب جو ذاکر صاحب اور جامعہ دونوں کو ہمیشہ شبہ اور حقارت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے اور قومی تحریکوں اور قومی سرداروں کو اسی نظر سے دیکھتے تھے جس نظر سے یہ ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں دیکھے جاتے تھے۔ ذاکر صاحب کی گفتگوئے مصالحت سن کر ذاکر صاحب کے قائل ہو گئے اور کہنے لگے "میں نہیں سمجھتا تھا کہ ذاکر صاحب کا دماغ اتنا سلجھا ہوا ہے اور ذہن اس درجہ رسا"۔

بنیادی تعلیمی اسکیم کی رپورٹ ذاکر صاحب نے علی گڑھ میں میرے ہی مکان پر ایک کمرہ میں بیٹھ کر شاید ایک ہفتہ کے اندر مرتب کر ڈالی کمرہ بھی جو بیک وقت سونے بیٹھنے، کھانے پینے، لکھنے پڑھنے اور دھند مچانے کا کام دیتا تھا۔ ہر طرح کے لوگ بیٹھے

ہوتے ہیں، کچھ دیر تک تعلیمی مسائل پر بحث رہی اسی سلسلہ میں کچھ دوست ملنے آگئے تو ان سے خوش گپی ہونے لگی، کتابوں رپورٹوں، فائل وغیرہ کا انبار ہے۔ کاغذات پھیلے ہوئے ہیں۔ ٹریننگ کالج کے لوگ آگئے تو ان سے تعلیمی مسائل پر بحث چھڑ گئی کوئی خوانچہ والا آگیا تو جو کچھ اس کے پاس رہا اسی سے شغل شروع کر دیا گیا۔ ڈاکٹر آگئے تو امراض و علاج کے لطائف چھڑ گئے شعر و شاعری کا شائق آگیا تو شعر خوانی کی مجلس گرم ہو گئی۔ کوئی اچھا طالب علم آنکلا تو اس کے مضمون پر باتیں ہونے لگیں غرض جو آیا اسی کے مذاق کے مطابق گپ ہونے لگی۔ اس تمام بحث مباحثے میں ذاکر صاحب اس خلوص و خوبی سے حصہ لیتے جیسے تمام عمر اسی شغل میں زندگی بسر ہوئی ہے جو آتا بہت کچھ سیکھ جاتا اور ایسا خوش ہو جاتا جیسے اس نے اس دن کوئی بڑا کام کیا تھا۔ ذرا مہلت ملتی تو پھر رپورٹ کی ترتیب شروع ہو جاتی وہ ہر شخص کے سامنے اپنے خیالات اور نتائج پیش کرتے اس کا مشورہ طلب کرتے، اپنی سمجھاتے اس کی سنتے اور پھر آخری رائے قائم کرتے۔

ایک دن میں نے تنگ آکر کہا: "مرشد یہ کہاں کا کھڑاگ پھیلایا جب دیکھیے بچوں کی عمر، بچوں کے مشاغل، گلی ڈنڈے اور سوت کپاس کی بحث چھڑی ہے تمام دن خدائی خواروں یا حق بخشوائے ہوئے لوگوں کا مجمع رہتا ہے۔" فرمایا "سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے آج اتفاق سے پنسل بنانے کے لیے کسی کے پاس چاقو نہ ملا ورنہ بقیہ مراحل بھی طے ہو جاتے۔ اب کل کوئی سبیل ایسی نکالیے کہ مجھے چند گھنٹے یکسوئی کے مل جائیں سارا خاکہ ذہن میں ہے رپورٹ مکمل ہو جائے گی۔"

دوسرے دن میں نے اپنے پرانے مکان کے بالاخانے پر ذاکر صاحب کو مقفل کر دیا، مقفل اس لیے نہیں کہ کوئی ملاقاتی بار نہ پائے بلکہ اس کا خطرہ تھا کہ خود مرشد نہ نکل جائیں۔ ہوا وہی جس کا خطرہ تھا۔ صبح بالاخانے پر مقفل ہوئے۔ دو گھنٹے گزرے

ہوں گے ایک صاحب ملنے آئے۔

نوکر نے کہا۔

"ذاکر صاحب کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔"

انھوں نے نقد و جرح شروع کی۔

مرشد کے کان تک آواز پہنچی، روشندان کچھ اونچا نہ تھا۔ اسٹول رکھ کر عزفہ سے بولے "ارے میں یہاں مقفل ہوں۔ کنجی رشید صاحب کے پاس ہے لیکن کوئی مضائقہ نہیں، آپ اس بات کا پتہ لگا لائیے۔

انہوں نے کہا "ہاں، رپورٹ نقل کر لایا ہوں۔"

فرمایا، "سنائیے۔"

انہوں نے سنانا شروع کیا۔ میں یونیورسٹی سے آیا تو رومیو جولیٹ کا یہ ڈراما نظر آیا۔

میں نے کہا مرشد یہ کیا ہے؟"

فرمایا۔ "ذرا ٹھہریئے گا بس ایک منٹ"

افسانہ ختم ہو گیا۔

میں نے بالا خانہ پر پہنچ کر قفل کھولا تو مرشد سارا کام کیے ہوئے چاروں شانے چت کچھ گنگنا رہے تھے، مجھے دیکھا تو لیٹے ہی لیٹے ایک زقند بھری اور سر و قد کھڑے ہو گئے فرمایا "ذرا پانی پلوائیے۔ کام ختم ہو گیا۔"

میں نے کہا، "یہ آپ کیا سن رہے تھے"

کہنے لگے، "فلاں رپورٹ کا حوالہ دینا تھا، ایک جگہ شبہ ہوتا تھا، اس لیے ان صاحب سے کہا تھا کہ اصل رپورٹ دیکھ آئیں۔ انھوں نے جو سنا! تو اطمینان ہو گیا کہ جو یاد تھا وہ ٹھیک تھا۔"

میں نے کہا۔ "اب تو جب تک آپ کا قیام ہے کوئی زق زق نہ ہو گی؟"
فرمایا "ہرگز نہیں" میں نے کہا "اللہ کا شکر ہے، آج ڈاکٹر اصغر کے ہاں چائے پی جائے تو کیسی رہے گی"؟ کہا "ضرور، ان سے بلی کا بچہ بھی لینا ہے۔"

میں نے کہا "بلی نے تو بچہ نہیں دیا ہے۔ کتے نے البتہ دیا ہے"۔ کہنے لگے "اسی کا سہی! سعیدہ (ذاکر صاحب کی بچی) کے لیے کچھ نہ کچھ لے جانا ضروری ہے گھر پہنچنے پر دو ہی تو سوال کیے جاتے ہیں۔ بیوی کہتی ہیں کیا کھویا اور سعیدہ پوچھتی ہے کیا لائے۔"

ڈاکٹر اصغر کے ہاں پہنچے تو میاں بیوی دونوں باغ باغ ہو گئے۔ ان کی اہلیہ ایک جرمن خاتون ہیں۔ ان کو نفیس کیک، بسکٹ اور انگریزی مٹھائی بنانے، اس سے زیادہ کھلانے اور مکان کو سجانے اور ستھرا رکھنے کا شوق اور مریض کی تیمارداری کرنے میں کمال حاصل ہے ذاکر صاحب کے پہنچتے ہی انھوں نے طرح طرح کی کھانے کی چیزیں لا کر رکھ دیں ہم سب نے کھانا اور ذاکر صاحب نے پوچھنے اور سیکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ کیک اور بسکٹ کے بنانے کا کیا طریقہ ہے اس کے لیے مخصوص چولھے اور تنور کیسے بن سکتے ہیں۔ مرغیاں پالنے کی کیا تدابیر ہیں اور یہ تمام باتیں محض لطف سخن یا عوائد رسمیہ کے طور پر نہیں بلکہ یہ سب اس لیے کہ جامعہ میں ان کو کس طرح نافذ کیا جائے۔ باورچی خانے میں جا کر چولھے کا نقشہ دیکھا اور سمجھا، مرغی اور بطک کے ڈربے دیکھے۔ ایک بطک پر ذرا زیادہ توجہ ڈال دی وہ بیگم اصغر نے دوسرے دن ذاکر صاحب کے اعزاز میں میز پر چن دی۔

ایک دن ڈاکٹر اسلام الحق انصاری آ گئے۔ ان سے پتھالوجی پر بحث ہونے لگی۔ اس زمانے میں ذاکر صاحب کو جامعہ کے لیے ایک ڈاکٹر کی ضرورت تھی لیکن ڈھنگ کا کوئی آدمی نہ ملتا تھا۔ اس لیے طے یہ کیا کہ کچھ اور نہیں تو قارورہ وغیرہ جانچنے کا جو طریقہ ہے وہ خود ہی ڈاکٹر انصاری سے سیکھ لیں۔ چنانچہ دوسرے دن طبیہ کالج پہنچے اور وہاں

سے سیکھ ساکھ کر واپس آ گئے۔ ذاکر صاحب نے انٹرمیڈیٹ سائنس میں کیا تھا اور میڈیکل کالج لکھنؤ میں قریب قریب داخل بھی ہو گئے تھے لیکن پھر چلے آئے اور بی اے میں فلسفہ اور اقتصادیات کے مضامین لے لیے۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا کہ ڈاکٹر انصاری سے جو کچھ سیکھ کر گئے تھے اس کا کاروبار کیسا چل رہا ہے، کہنے لگے "خوب چل رہا ہے معمولی جانچ کا کام بالکل آسان ہے۔"

میں نے کہا "مرشد تشخیص امراض اور معالجہ کے آپ نے بہت سے طریقے تو خود ایجاد کیے ہیں، کیا ہرج اگر آپ یونانی طب کا بھی مزاج دریافت فرمالیں۔"

فرمایا، "وہاں فن کی اتنی ضرورت نہیں ہے، جتنی عقل اور تجربہ کی۔"

میں نے کہا "کیا بات ہوئی"، کہنے لگے "آج کل مشین اور کتابوں نے ہر کام کو اتنا آسان بنا دیا ہے کہ عقل اور تجربہ کو کوئی کام میں نہیں لاتا۔ صرف فیصلہ یا بشارت دے دیتا ہے۔"

اچھا ایک لطیفہ سنیے، جامعہ کے چھوٹے بچوں کے ایک بڑے میاں نگراں تھے۔ ایک بچے کی طبیعت خراب ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب بلائے گئے، نگراں نے مرض کی تاریخ سنانی شروع کی۔ کتنے دن ہو گئے یہ استعمال کیا وہ استعمال کیا حتیٰ کہ تھرمامیٹر بھی استعمال کیا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ ڈاکٹر چپ ہو گیا۔ اس نے معمولی دوا لکھ دی، پرہیز پوچھا گیا تو اس نے بتایا سوائے آپ سے پرہیز کرنے کے اور کسی پرہیز کی ضرورت نہیں ہے۔

مجھے ذاکر صاحب کو چھیڑنے میں زیادہ لطف آتا ہے، میں نے کہا "مرشد چشم بد دور آپ سراپا سے بھی جالینوس معلوم ہوتے ہیں، ڈاکٹر کہلاتے ہی ہیں اگر اس وقت کوئی آجائے اور آپ کو نبض اور قارورہ دکھائے تو آپ کیا کریں گے۔"

کہنے لگے "نبض سے تو صرف مریض پر توجہ ڈالی جاتی ہے۔ قارورہ سے ہاضمہ کا اور نبض سے عادات کا نقص بتانا چاہیے۔ معمولی لرزہ بخار، کھانسی زکام، پیچش میں تو عقل صرف

کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف دوا بتا دینا کافی ہے۔ سفید پوش پیشہ ور مریضوں کو باتوں پر دھر لیجیے۔ وہ دوائیں پہلے سے کھاتے ہوں گے۔ اور آپ چاہے جو بتائیں استعمال وہ اپنی ہی دوا کریں گے ہر شخص چاہے گا یہ کہ اسے وہی چیز کھونے کو پھر مل جائے جو وہ کھو چکا ہے نوجوانوں کے امراض متعین ہیں لیکن ان کا اقرار وہ صفائی سے نہیں پھر ڈٹ سے کریں گے اور اپنے امراض کو تاثرات کے پردے میں طرح طرح سے ملمع و مرصع کرکے بیان کریں گے۔ مثلاً وہ کسی طبیب کے ہاں جائیں گے تو شروع اس طور سے کریں گے کہ ان کے سر میں درد رہتا ہے، پھر حلق کی خرابی بتائیں گے، اس کے بعد نزلہ زکام اور تداخل فصلیں پر اظہار خیال ہوگا۔ وہاں سے اتر کر معدہ کی بے وفائی کا تذکرہ کرتے کرتے آخری تان یا "خلاصۂ فریاد" بقیہ اعضائے رئیسہ کی نارسائی پر توڑیں گے۔!

ذاکر صاحب کی تقریر و تحریر دونوں میں ایک خاص چیز ملتی ہے۔ جو کہیں اور کم دیکھی گئی ہے۔ ماہرین طبیعات کا مدتوں خیال رہا کہ روشنی کی رفتار بخط مستقیم ہوتی ہے بعد کی تحقیقات یہ ہے کہ اس کی رفتار بخط مستقیم نہیں بلکہ جست و خیز کے ساتھ ہوتی ہے ذاکر صاحب کی تحریر و تقریر دونوں میں یہ بات ملتی ہے۔ وہ مروجہ طریقوں سے کام نہیں لیتے بلکہ شروع سے آخر تک سامع یا قاری کی توجہ کو اپنے الفاظ اور خیالات کی تازگی و توانائی سے تب و تاب دیتے ہیں۔ اور اس کے تصورات کو نہ تھکنے دیتے ہیں نہ دم لینے دیتے ہیں۔ کم لوگوں کی تحریر و تقریر حشو و زوائد یا بندھے ٹکے الفاظ و عبارت سے اتنی پاک ہوتی ہے جتنی کہ ذاکر صاحب کی۔ ان کی تقریر میں نہ خطابت ہوتی ہے نہ موعظت لیکن خطابت کا زور اور گرمی اور موعظت کی رحمت و شائستگی بدرجۂ اتم ملتی ہے الفاظ و عبارت میں صفائی، خیالات میں رفعت اور جذبات میں سچائی ہوتی ہے ذاکر صاحب تقریر کرتے ہیں تو مجھے پہاڑ کی فضا یاد آجاتی ہے۔ پہاڑ ہی کا اوج، وزن و وقار ان

کی تقریر اس چشمہ کی مانند ہوتی ہے جو اپنی سیل سفر کی ہر منزل میں شفاف شادماں وشگرف کار رہتا ہے لیکن جہاں کہیں ذاکر صاحب نے ملک پر چھائی ہوئی تاریک کہر اور ساتھیوں کے تذبذب یا تھکن کی طرف اشارہ کیا ہے وہاں ان کا لہجہ دھیما اور حزیں ہو گیا ہے الفاظ میں مرہم ہے لیکن پیغام میں وہی گرمی اور جگر تابی ہے۔ جو ذاکر صاحب کی رگ رگ میں سرایت کیے ہوتے ہے۔

ذاکر صاحب کی تقریر کا لطف اس وقت دوبالا ہو جاتا ہے جب حاضرین میں سے کوئی بڑا اور برخود غلط آدمی بے سمجھے بوجھے محض اپنی اہمیت جتانے کے لیے اعتراض کر دے۔ طالب علمی کے زمانے میں یونین میں ذاکر صاحب کی جوابی تقریر سننے کے لیے ہم سب خاص طور پر جمع ہوا کرتے تھے ایک سال وائس پریسیڈنٹ کے لیے ذاکر صاحب بھی امیدوار تھے، سارے طلباء خواص وعوام کے نام سے دو گروہ میں منقسم ہو گئے۔ ذاکر صاحب عوام کی طرف سے کھڑے ہوئے تھے۔ ہر فریق کے امیدوار کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی قابلیت واہمیت جتانے کے لیے یونین میں تقریر کرے چنانچہ ذاکر صاحب کو بھی بحث کے لیے عنوان دینا پڑا۔ مخالف جماعت نے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ ذاکر صاحب کے لیے فلاں پروفیسر نے تقریر لکھ دی اور وہ اس کے رٹنے میں مصروف ہیں۔ مباحثہ کا وقت آیا یونین ہال میں تل رکھنے کی گنجائش نہ تھی۔ ذاکر صاحب کا نام لیا گیا اور ہال تالیوں اور سیٹیوں سے اس طور پر گونجا جیسے "ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار"

ذاکر صاحب دائیں طرف کے اسٹینڈ پر آئے اور بولے "میں نہایت ادب کے ساتھ لیکن ضابطہ سے اپنی موضوع بحث کو اس مجلس کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ مجھے اس بارے میں جو کچھ عرض کرنا ہے وہ میں اپنی جوابی تقریر میں عرض کروں گا فی الحال اتنا ہی عرض کرنا ہے۔" یہ کہہ کر اپنی جگہ پر لوٹ آئے، لیکن فوراً ہی ایک اودھم مچ گیا

فریق مخالف نے خوب خوب پھبتیاں کسیں۔ اور شور مچایا۔ یہ معلوم ہوا جیسے الکشن کے نتیجے کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ ذاکر صاحب کے حمائتیوں کا یہ حال کہ کوئی غصہ میں کوئی مایوس ہو کر کوئی اپنے آپ پر نفرین کرتا ہوا اور کوئی ذاکر صاحب کو آنکھوں آنکھوں میں تناول کرتا مجمع سے جانے لگا۔ کچھ اس طور پر جم کے بیٹھ گئے کہ یا تو مار ڈالیں گے یا مر کے اٹھیں گے مخالفین کی بن آئی تھی اس دن صرف مخالفین نے تقریریں کیں اور جس کے دل جو آیا اس نے ذاکر صاحب اور ان کے حمائتیوں کو سنا ڈالا۔

جواب کا وقت آیا تو ذاکر صاحب پھر اسٹینڈ پر آئے۔ اُن کے موافقین بھی جو یونین کے باہر آس پاس چہ میگوئیوں میں مصروف اور کچھ پھرے ہوئے دروازے سے لگے کھڑے تھے رفتہ رفتہ واپس آئے۔ ذاکر صاحب پر عالم کچھ ایسا طاری تھا کہ کسی نے تالی تک نہ بجائی۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ موضوع بحث پر اب بھی میں کوئی تقریر نہ کروں گا صرف مخالف تقریروں کا جواب دوں گا۔ اس کے بعد انہوں نے ہر مخالف کے دلائل کے جواب دینے شروع کیے اور جہاں تہاں ان کے آداب محفل، انداز و لہجہ پر فقرے بھی چست کرتے گئے۔ مجمع سے صدائے تحسین بلند ہونی شروع ہوئی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بہت بڑا شاعر اپنی بہترین نظم سنا رہا ہے جس کے ایک ایک شعر پر مجمع تلے اوپر ہو رہا ہے۔ تقریر ختم ہوئی رائے لی گئی تو سارا ہال موافقت میں کھڑا ہو گیا۔ صدر نے نتیجہ کا اعلان کیا اب ذاکر صاحب کے موافقین کی بن آئی تھی انہوں نے مخالفین کا پیچھا گھر تک نہ چھوڑا پانی پت کی آخری لڑائی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو ایسی شکست دی کہ جنوبی ہند میں کوئی مرہٹہ خاندان ایسا نہ تھا جس کے ہاں صف ماتم نہ بچھ گئی ہو یہی حال ذاکر صاحب کی تقریر اور ان کے چنے تلے برجستہ فقروں نے مخالفین کا کیا۔

مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ایک جلسہ میں سر سلیمان مرحوم صدر تھے اراکین میں سے ایک صاحب اپنے آپ کو بڑا اطباع اور یگانہ روزگار سمجھتے تھے اور ہر لمحہ اپنی نشست سے بیٹھے بیٹھے لوگوں پر فقرے چست کیا کرتے تھے اور کوشش کرتے تھے ان کی موجودگی میں کسی کی پیش نہ جائے۔ ذاکر صاحب نے ایک مسئلہ پر تقریر کی جس کو ہر شخص نے غور و احترام کے ساتھ سنا۔ بڑے سے بڑے مخالف محموں میں بھی ذاکر صاحب کی تقریر ہمیشہ خاموشی اور احترام سے سنی گئی۔ یہ امتیاز میں نے کم لوگوں میں پایا۔ تقریر کے ختم ہوتے ہی وہ صاحب تلملا اٹھے اور فوراً اپنی نشست پر سے ایک پوائنٹ آف آرڈر سر کیا۔ جس میں تفاخر اور خود نمائی کی شان پورے طور پر جلوہ گر تھی۔ بولے "جناب والا نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ ذاکر صاحب نے ابھی جو تقریر کی ہے وہ بالکل میری سمجھ میں نہیں آئی" کچھ اور ارشاد فرمانے والے ہی تھے کہ ذاکر صاحب نے اٹھ کر فرمایا "جناب والا میں نے اپنی تقریر میں کہیں اس کا دعویٰ نہیں کیا ہے کہ میری تقریر محترم ممبر کی سمجھ میں آئے گی" اس پر ایسا بے محابا قہقہہ پڑا کہ سر سلیمان مرحوم جیسے ثقہ آدمی جو ایسے مواقع پر اپنی طرف سے کبھی بے تکلف نہیں ہوتے تھے بے اختیار ہنس پڑے اور معترض صاحب کچھ ایسے سٹ پٹائے کہ دوران مجلس میں صرف سکوت پر قانع رہے۔

کورٹ ہی کا ایک اور جلسہ بھی مجھے کبھی نہ بھولے گا اس میں جو مسئلہ زیر بحث تھا وہ اس درجہ اہم اور متنازعہ فیہ تھا کہ کورٹ کے یا اقتدار اراکین ہر گوشہ ملک سے بڑی کثرت سے شریک ہوئے تھے اور جو کچھ فیصلہ ہونے والا تھا اس میں کہیں شک و شبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی تھی۔ فضا ایسی دگرگوں تھی کہ بڑے بڑے شخص کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ مخالفت میں تقریر کرنا تو درکنار مخالفت میں چپکے سے ہاتھ اٹھانے کی بھی جراءت کر سکے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ہر طرف سرنگیں بچھی ہوئی ہیں جس نے قدم اٹھایا وہ جان سے گیا۔ معمولی ابتدائی کاروائی شروع ہو کر ختم ہوئی۔ تحریک پیش

کرنے والوں میں ایسے اصحاب تھے جو قانونی قابلیت، قومی خدمات، ذاتی جاہ وحشمت ہر اعتبار سے قوم اور ملک میں خاص درجہ رکھتے تھے۔ یہ مرحلہ بھی ختم ہوا۔ اور وہ لمحہ آیا جب اس کی مخالفت میں کوئی کھڑا ہو، جن لمحے ایسا سناٹا رہا کہ ہر شخص اپنے قلب کی حرکت سن سکتا تھا۔ معرکہ میں پہلا قدم اٹھانے والا اور پھر پیچھے مڑ کر نہ دیکھنے والا ہی مرد کہلاتا ہے۔ ذاکر صاحب سب کے پیچھے کی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُٹھے محض ایک جملہ کہہ کر بیٹھ گئے "یہ تحریک قانوناً ناپیش نہیں کی جا سکتی!" سارا مجمع مڑ کر پیچھے دیکھنے لگا۔ قانون میں جن صاحب کا پایہ ہائی کورٹ تک مسلّم تھا اور جو اس تحریک کے قانونی پشتیبان تھے۔ کڑک کر بولے۔ "قانونی سقم کوئی نہیں ہے میں چیلنج کرتا ہوں!" جلسہ میں جو لوگ بحث کرنے یا سمجھنے کے لیے نہیں، بلکہ ہاتھ اٹھانے یا اودھم مچانے کے لیے آتے ہیں یا بلائے جاتے ہیں ان کی بن آئی تھی۔ ذاکر صاحب نے ایک لفظ نہ کہا، بڑی مشکلوں کے بعد جب مجمع کو کسی قدر خاموش کیا گیا۔ اور فاضل معترض نے اپنا چیلنج دہرایا تو ذاکر صاحب نے ان کو ایک اور موقع کی یاد دلائی جب انہوں نے ایسے ہی ایک مسئلہ میں ذاکر صاحب کو چیلنج دیا تھا اور بعد میں اپنی غلطی تسلیم کی تھی اور فرمایا ایسے مواقع پر چیلنج نہیں دیتے سوچتے ہیں۔ ذاکر صاحب نے اب ایک مختصر سی تقریر کی اور اپنے اعتراض کی بڑی سنجیدگی لیکن وثوق اور دبدبہ کے ساتھ وضاحت کی! جلسہ کے مدبّروں نے غور کیا تو ذاکر صاحب کا اعتراض صحیح نکلا۔ معترض نے اپنی غلطی تسلیم کر لی۔ ہال کے اندر بڑی دیر تک دوڑ دھوپ اور خفیہ سرگوشیاں ہوتی رہیں۔ بالآخر ذاکر صاحب ہی کی مشورت سے مطالبہ کی نوعیت بدلی گئی اور کارروائی شروع ہوئی۔

علمی اور فنی مسائل پر تحقیقات کرنا اور ان سے طلباء کو آشنا کرانا یونیورسٹی کے معلمین کا فرض منصبی ہے۔ ذاکر صاحب کے آنے پر یہ چرچے دن رات کے ہو جاتے ہیں اور ذاکر صاحب سے ہر موضوع پر خواہ وہ عقل اول ہو خواہ ازدواج مکرر بڑے لطف

سے اور بڑے اونچے درجہ کی گفتگو کی جا سکتی ہے۔ اساتذہ، طلباء، اجنبی اور احباب کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ ذاکر صاحب کا مسائل کے منقح کرنے کا طریقہ دل نشین لیکن نہایت مشکل ہے۔ وہ ہر مسئلہ پر روزمرہ کے پیش آنے والے حالات واقعات کی روشنی میں گفتگو کرتے ہیں۔ عام طور پر بحث کرنے میں لوگ صرف اپنے نقطۂ نظر کو پیش پیش رکھتے ہیں اور بحث میں الجھاؤ اور بدمزگی بھی اکثر اسی طریقہ کار سے پیدا ہوتی ہے ذاکر صاحب گفتگو کرنے میں اپنے مخاطب اور معترض ہی کے نقطۂ نظر کو اپنا لیتے ہیں اور مسئلہ کو منقح کر دیتے ہیں اس طور سے معترض کو کبھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اس کی قابلیت یا اس کے اصول عقیدہ کو ٹھیس پہنچائی گئی کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ خود مخاطب کے نقطۂ نظر کی تنقیح و توضیح اس طور سے کر دی ہے کہ وہ اپنی بڑائی محسوس کرنے لگا اور غیر شعوری طور پر ہمیشہ کے لیے ذاکر صاحب کی ہمدردی قابلیت اور شخصیت کا شیدائی ہو گیا۔

ذاکر صاحب کی بلند نظری، دردمندی اور وسعت قلب کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کے مخالف بھی جب کبھی ان کی مدد کے خواستگار ہوئے تو انہوں نے نہ صرف بغیر پس و پیش کے بلکہ بڑے خلوص سے ان کی مدد کی۔ واردھا تعلیمی کمیٹی رپورٹ کے سلسلے میں ان کو جس سفاہت اور سفاکی سے رسوا کیا گیا وہ کوئی راز نہیں ہے۔ اور کوئی قابل فخر کارنامہ بھی نہیں۔ اس رپورٹ کے بعد آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے کمال یار جنگ تعلیمی کمیٹی کی طرح ڈالی جس کا کام اب تک ختم نہیں ہوا ہے لیکن مجھے معلوم ہے کہ جس زمانہ میں اس کمیٹی پر ایک نازک دور گزر رہا تھا۔ نواب کمال یار جنگ مرحوم جب کبھی دہلی آتے تو ذاکر صاحب سے ملتے اور کمیٹی کے کام کو حسن خاتمہ پر پہنچانے کی سبیل ذاکر صاحب سے دریافت کرتے اور اعانت کے طلبگار رہتے واردھا رپورٹ جب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مختلف منازل سے گزر کر صوبہ متحدہ کی حکومت میں پہنچی تو کانفرنس کی حمایت میں اور کانفرنس کے ہی نقطۂ نظر کو ذاکر صاحب

نے وہاں کے ماہرین کے سامنے واضح کیا اور منوایا۔!

میں نے کہا۔

"مرشد یہ کیا بات ہوئی؟"

تو فرمایا۔

"ہوئی کیا اغیار میں اپنوں کی رسوائی دیکھی نہیں جاتی"

وارد ھار پورٹ سب سے پہلے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے پٹنہ کے اجلاس میں پیش ہوئی۔ ذاکر صاحب آنکھوں کی سخت اذیت میں مبتلا ہو کر بمبئی گئے ہوئے تھے۔ جہاں ان کی آنکھوں پر آپریشن کیا گیا تھا۔ ڈاکٹروں کی سخت ممانعت کے باوجود انہوں نے ایک صاحب کو خفیہ طور پر بلا کر اسی حالت میں کہ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور طبیعت نڈھال تھی۔ ایک خط نواب صدر یار جنگ بہادر، سکریٹری کانفرنس کو لکھوایا، جس میں انہوں نے کمیٹی کی بنیادی سفارشات کی اہمیت بڑی قابلیت، اور بڑے ہی درد سے جتائی تھی، یہ خط ذاکر صاحب کے خلوص، قابلیت، دلسوزی اور خود انشاء پردازی کا بڑا نادر نمونہ ہے۔ یہ خط عام نظروں کے سامنے آیا یا نہیں، مجھے نہیں معلوم، لیکن میں نے اسے دیکھا ہے۔ غور سے اور دیر تک پڑھا ہے، اس کا آخری شعر یہ ہے۔

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری

میری دعا ہے کہ تیری آرزو بدل جائے

موقع کی اہمیت اور خود لکھنے والے کی حالت کا اندازہ کرتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال نے بھی کچھ ایسے ہی عالم میں پہنچ کر یہ شعر کہا ہوگا۔ شاعری اور انشا پردازی میں بھی ایک مرحلہ آتا ہے، جب

ریحان دہد از مینا، رامش چکد از قلقل!

یہ بات صنعت گری کے بس کی نہیں ہے۔ یہ تو اسی وقت آتی ہے جب نظر میں

وسعت، فکر میں گہرائی، دل میں سچائی اور اخلاق میں پاکی ہو!

ذاکر صاحب کے ساتھ سفر اور شاپنگ (چھوٹی موٹی چیزوں کی دکانوں سے خریداری) کا جو لطف ہے وہ کم لوگوں کے حصہ میں آیا ہوگا۔ سفر میں آپ کم ایسے ساتھی پائیں گے جو اچھی جگہ پر خود قبضہ پانے کی فکر نہ کریں۔ ہار جیت کا کوئی تفریحی کھیل آپ ہارنے یا جیتنے لگیں تو فوراً ظاہر ہو جائے گا کہ آپ شرافت و انسانیت کی کس منزل میں ہیں۔ شاپنگ میں معمولی ساتھی بہت جلد اکتا جاتا ہے اور چاہے وہ کتنی ہی کوشش اس کے خلاف کیوں نہ کرے اس کی بیزاری ظاہر ہو جائے گی۔ بالخصوص ایسی حالت میں جب وہ اپنا کام ختم کر چکا ہو اور سب سے کٹھن آزمائش تو وہ ہے جب آپ کی قسمت میں خواتین کے ساتھ شاپنگ کرنا لکھا ہو، بعضوں کا یہاں تک خیال ہے کہ آپ عورتوں کے ساتھ بغیر لنگڑائے یا روئے شاپنگ ختم کر لیں تو جہنم کے ستر گز معاف کر دیے جائیں گے۔

ذاکر صاحب کے ساتھ میں نے سفر بھی کیا ہے اور شاپنگ بھی وہ ان دونوں کے آداب اس خوبی اور بے تکلفی سے برتتے ہیں کہ آپ کا دل یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ زندگی کے یہ دونوں مشاغل اچھے مشاغل ہیں شاپنگ کا تو مجھے مرض ہے جس طرح بعض خبطی علی الصباح بلا قید موسم و موقع بے ضرورت غسل کرنے یا ٹہلنے سے باز نہیں آتے اور شریفوں کے سامنے فخر کرنے سے نہیں شرماتے اور اس روزمرہ میں خلل آ جائے تو تمام دن سکرات میں مبتلا رہتے ہیں ویسے ہی میں اگر نئی جگہ جاؤں اور وہاں محض قوم کے درد میں مبتلا رہوں اور شاپنگ کرنی نصیب نہ ہو تو میں بھی آپے میں نہیں رہتا اور سمجھتا ہوں کہ لوگ انسانیت پر فخر کیسے کرتے ہیں جب مجھے شاپنگ کرنے تک کی فرصت یا مقدرت نہیں!

شاپنگ کا میرا اصول یہ ہے کہ روپے کم خرچ کیے جائیں۔ اشیاء زیادہ خریدی جائیں۔ دوڑ دھوپ زیادہ کی جائے، روپے زیادہ ہوں تو کم خرچ کرنا آسان ہے جب

کم ہوں تو کم خرچ کرنا بڑا مشکل فن ہے اور بالکل نہ ہونے پر بھی خرچ کیے جانا تو خاصان خدا ہی کا خاصا ہے۔ ایسی حالت میں اگر کوئی نادر چیز نظر آجائے تو کسی صاحب مقدرت کی تلاش کروں گا اور اس سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے لیے اُسے خرید لے۔ اور میرے ذوق خواری یا خریداری کو تسکین پہنچائے!

دلّی میں جب ذاکر صاحب کا ہر جگہ اور جامعہ کا صرف قرولباغ میں قیام تھا اس وقت شاپنگ کا لطف تھا۔ ہماری شاپنگ پٹری پر بیٹھ کر بیچنے والوں کے ہاں ہوتی تھی کہیں سے کوئی رنگین کیلنڈر، کہیں سے مشین گزیدہ تولیے، موزے، بنیائن، کہیں سے ستم رسیدہ کیلے، کہیں سے پینسلین کی گولیاں خریدیں۔ گھر سے نمونے کی جیل، چلین، اون، بٹن وغیرہ کے ایسے نمونے لے گئے جو کہیں نہ میسّر آئیں۔ جاپانی فاؤنٹن پن کا جائزہ لیا اور نب کے آزمانے، دیکھنے میں ایسے مصروف ہوئے کہ اس سے کچھ کم ہی دیر کسی مضمون کے لکھنے میں لگا دیتے تو چاندنی چوک میں بلوا اور قوم میں چندہ ہونے لگتا۔ فتح پوری سے چاندنی چوک ہوتے ہوئے جامع مسجد تک آئے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کباڑیوں کے ساز و سامان پر شاطرانہ نظر ڈالتے ہوئے کباب والے کی دوکان پر پہنچ گئے کچھ کھایا کچھ خریدا بقیہ کو "اللہ بس باقی ہوس" کہا اور وہاں سے جامع مسجد کی ساخت اور جامعہ کی پرداخت پر مرشد سے بحث کرتے ہوئے قرولباغ واپس آگئے۔

اس تمام مدت میں مرشد اس دل و جان سے گھومنے پھرنے، کھانے پینے، لطف اٹھانے اور لطف پہنچانے میں شریک رہے گویا ان کے نزدیک اس سے بہتر سلوک میں ان کے ساتھ نہ کر سکتا تھا۔

مئی میں لو کی شدت تھی علی گڑھ سے دو بجے دن کو گاڑی چلتی تھی، مرشد کا ساتھ تھا۔ میں نے کہا "سفر کیسے ہوگا لو لگی تو کہیں کے نہ رہے"۔

فرمایا "چلیے بھی آلکھ بچا کر نکل جائیں گے"۔

گاڑی آچکی تھی اور چھوٹنے کے قریب تھی ایک صاحب کو ٹکٹ خریدنے کے لیے روپے دیئے اور ہم دونوں بھاگ کر ایک ڈبے میں بیٹھ گئے جو تنور کی طرح دہک رہا تھا،

مرشد ایک لمبا تولیہ اوڑھ کر خالی سیٹ پر لیٹ گئے۔ اس دن تو اس شدت کی تھی کہ رہ رہ کر یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ ڈبہ کہیں کہیں سے سلگنے نہ لگے مرشد کی طرف دیکھا تو سر سے پاؤں تک تولیہ میں ملفوف بڑے سکون کے ساتھ چت لیٹے ہوئے تھے صرف دونوں آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

میں نے کہا "تھوڑی دیر کے لیے سو نہ جائیے"

اشارے سے کہا نہیں۔

میں نے کہا "کیوں"؟

فرمایا۔ "آنکھ جھپکی نہیں اور اس نے مارا نہیں۔!"

میں نے کہا "کس نے؟"

فرمایا۔ "لو نے"

میں نے کہا "ٹکٹ کلکٹر آیا تو؟"

مرشد نے آہستہ آہستہ آنکھ بند کر لی۔!

غازی آباد کے اسٹیشن پر گارڈ ٹکٹ دے گیا۔

مرشد نے کہا۔ "لو اور ٹکٹ کلکٹر دونوں سے بچ گئے۔ اب کیا ہو؟"

میں نے کہا "اس کا جشن منایا جائے"۔

مرشد نے فوراً سنترے خریدے اور اتنے خریدے کہ قرولباغ تک ختم نہ ہوئے

ذاکر صاحب کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں ہے کہ ان کی اردو کی تقریر و تحریر بہتر ہوتی ہے یا انگریزی کی۔ طالب علم کے زمانے میں کالج میگزین میں رپ RIP

کے نام سے وہ کالج کی زندگی پر بڑے دل کش مضامین لکھا کرتے تھے جس کا لوگ بڑے شوق سے انتظار کیا کرتے تھے۔ انگریزی کے بارے میں ایک بار مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر مسٹر ریز یا تھم نے کہا تھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی انگریزی تحریر و تقریر بالخصوص انکی حاضر جوابی کا مقابلہ برطانوی پارلیمنٹ کے بہترین اراکین سے کیا جا سکتا ہے۔ اردو تحریر کے نمونے میں نے گزشتہ اوراق میں دیے ہیں۔ انگریزی کے نمونے پیش کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ علی گڑھ میں رہ کر اور اس سے باہر بھی میں نے انگریزی ہی کی اچھی تقریریں سنی ہیں لیکن ہر طرح کے تکلفات سے قطعاً بری، رواں، چنچی تلی، دل نشین، فکر انگیز۔ انگریزی تقریریں نے ذاکر صاحب ہی سے سنی، ان کی تقریر کا ایک جملہ بھی زائد از ضرورت نہیں ہوتا اور شروع سے آخر تک استوار، شریفانہ اور ہر فقرہ میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوتی ہے، آپ ان کے کسی فقرہ کے ابتدائی الفاظ سن کر یہ نہیں بتا سکیں گے کہ اس فقرہ کی یہ پرداخت ہوگی یا یوں ختم ہوگا۔ ہمیشہ وہ اس کو اس طرح ختم کریں گے کہ آپ متحیر بھی ہوں گے اور خوش بھی۔ عام تقریر کرنے والوں کی مانند وہ جسم کے کسی حصہ کو خاص طور پر جنبش یا جھٹکے نہ دیں گے لیکن بحیثیت مجموعی آپ کو یہی محسوس ہوگا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس میں ان کے سارے جسم و جان کی کارفرمائی ہے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ اپنی تقریر سے اپنے گرد ویسی ہی فضا پیدا کر لیتے ہیں یا وہ خود ایک فضا ہیں جس سے ویسی ہی تقریر برآمد ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب کو خاموش دیکھ کر اکثر ذہن غالب کے اس مصرعہ کی طرف منتقل ہوتا تھا ؎

چشم خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے

ذاکر صاحب سے میرے تعلقات بڑے گہرے اور بڑے پرانے ہیں لیکن قومی زندگی میں میرا ان کا کبھی ساتھ نہ ہوا۔ وہ قلندر، میں دنیا دار، انہوں نے زندگی کے جو مصائب اٹھائے ہیں ان کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ زندگی کے جن آستانوں پر میں نے سر جھکایا ان آستانوں نے ذاکر صاحب کے سامنے بہم سجدے کیے اور ٹھکرائے گئے۔

ذاکر صاحب مجھ سے تھوڑی سی بھی قربانی کرنے کو کہیں تو شاید میں نہ کر سکوں۔ ممکن ہے یہی سبب ہو کہ انھوں نے مجھ سے اس قسم کی فرمایش نہ کی۔ میں نے ان سے بڑی سے بڑی فرمایش کی اور انھوں نے ذرہ برابر ہچکچائے بغیر اسے پورا کر دیا۔ ایک واقعہ سنیے ۷۔۸ سال ہوئے ہوں گے ایک دن صبح کو میں اور ذاکر صاحب ناشتہ کر کے کمرہ سے نکلے تھے کہ میرے دل میں اچانک ایک خیال آیا۔

میں نے کہا۔ "ذاکر صاحب آپ فلاں صاحب سے صلح کیوں نہیں کر لیتے مجھے بڑی خوشی ہو گی۔"

ذاکر صاحب میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا "سبحان اللہ کیا مصرعہ موزوں فرمایا ہے۔ آخر آپ کو سوجھی کیا؟"

میں نے کہا۔ "اس کو کیا کیجیے، مجھے تو ایسی ہی سوجھتی ہے۔"

کہنے لگے "تو یہ کون سی بڑی بات ہے آپ کہتے ہیں تو ہو جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "ابھی چلیے۔"

مرشد تیار ہو گئے۔

اور ہم دونوں وہاں پہنچے تو معلوم ہوا وہ صاحب موجود نہیں ہیں بات آئی گئی ہو گئی اور جہاں کی تہاں بھی رہ گئی۔

یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا جن صاحب سے میں صلح کرانے گیا تھا وہ ذاکر صاحب کے جب بھی بڑے دشمن تھے اور اب بھی ہیں۔

اب جب کبھی اس واقعہ کی یاد آتی ہے تو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے لیکن ذاکر صاحب کی شرافت، وسعت قلب اور دوست نوازی پر نظر کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کو جن دشواریوں کا سامنا ہوا ان سے عہدہ برآ ہونے کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی کوشش علی گڑھ تحریک کے ماتحت ہوئی۔ جس کے بانی سرسید اعظم علیہ الرحمۃ اور ان کے رفقائے کرام تھے اس تحریک نے ان دشواریوں کو بڑی حد تک دور کیا جن سے مسلمان اس وقت دوچار تھے لیکن اس کے سامنے مسلمانوں کے مستقبل کی تشکیل و تعمیر کا کوئی نامی اور منظم پروگرام نہ تھا۔ اس تحریک کی خوبی اور خامی دونوں یہ تھی کہ اس کو حکومت کی اعانت حاصل تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علی گڑھ اس راستے سے سرمو انحراف نہیں کر سکتا تھا جو حکومت نے اپنے مصالح و مقاصد کو مدنظر رکھ کر مقرر کر دیا تھا۔ اس سے جو فائدہ ہو سکتا تھا مسلمان اس سے بہرہ مند ہوئے لیکن اس میں جو بنیادی خامیاں تھیں ان سے مسلمانوں کو نقصان بھی پہنچا۔ حکومت کی سرپرستی سے منصبی اقتدار ضرور حاصل ہوتا ہے اور منصبی اقتدار سے جو فائدہ حاصل ہوتا ہے وہ بھی مسلّم لیکن اس کا نقص یہ ہے کہ شخصی عظمت کی نشو و نما کا کوئی موقع نہیں ملتا دنیا کے موجودہ ہیجان و بحران کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ شخصیت کی گرانمائیگی کو اداروں کی مصلحت پر قربان کر دیا گیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم اپنے اداروں کے غلام ہیں اور ہم میں اسکی صلاحیت باقی نہ رہی کہ ادارے ہماری ضرورت تسلیم کریں۔

اس تحریک کا سب سے نمایاں اور اہم ردّ عمل ترک موالات کا وہ حملہ تھا جو ۱۹۲۱ء میں ایم اے او کالج پر ہوا۔ یہ حملہ کامیاب بھی ہوا اور ناکامیاب بھی، ناکامیاب ان معنوں میں کہ بنیادی طور پر علی گڑھ جہاں کا تہاں رہا اور کامیاب یوں کہ اس وقت کے بیشتر اچھے طلباء علی گڑھ سے نکل کر جامعہ میں شامل ہو گئے۔

جامعہ کی بنیاد علی گڑھ میں رکھی گئی۔ ابتدا میں جو اس کو دشواریاں پیش آئیں وہ نئی نہ تھیں۔ جامعہ کا قیام بڑی ہلچل میں عمل میں آیا تھا۔ سیاست کے لیڈر بالعموم تعلیم کے لیڈر نہیں ہوتے لیکن طالب علم اور تعلیمی اداروں کو اپنا سب سے مؤثر اور آسان

Shibli Memorial Library
Librarian

حربہ سمجھتے ہیں اور بنا لیتے ہیں۔ تعلیم کو سیاست کی باندی بنانا ایسا ہی عبث اور خطرناک ہے جیسے سمندر کی لہریں سمندر کی وسعت اور گہرائی کو اپنے قبضہ میں لانے کی کوشش کریں۔ سیاسی لیڈر ہمیشہ طالب علموں سے اپنا کام لیتے ہیں ان کی زندگی کو سدھارنے کی پروا نہیں کرتے۔ ان ہی وجوہ سے جامعہ کا ابتدائی دور علی گڑھ میں کامیاب نہ رہا اور حکیم اجمل خاں صاحب اور ڈاکٹر انصاری صاحب اسے دہلی لے گئے تھوڑے دن بعد جب ذاکر صاحب اور ان کے رفقا اپنی اپنی تعلیم ختم کر کے یورپ سے ہندوستان واپس آئے تو جامعہ کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ جامعہ اور اس کے کارکنوں نے سیاسی سرگرمیوں سے علیحدگی اختیار کر لی۔

ان پچیس سال میں جامعہ کو کن آزمایشوں سے گزرنا پڑا۔ کون مصیبتیں دور ہوئیں اور کن نئی آفتوں کا سامنا ہوا۔ یہ داستان تو جامعہ کا کوئی مستند مورخ لکھے گا۔ میں تو صرف یہ دیکھ سکا ہوں کہ جامعہ کس طرح ذاکر صاحب کی شخصیت کے سہارے اور اس سے سیراب ہو کر اپنے مخصوص بلند نصب العین سے قریب تر ہوتی رہی اور باوجود صدہا دشواریوں کے اس نے نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ تمام ہندوستان میں ایک نئی ذہنی بیداری پیدا کی اور اسے پروان چڑھایا۔ ترک موالات کی تحریک بڑی حد تک ناکامیاب اور نامقبول ہو چکی تھی۔ عام خیال یہ تھا کہ جامعہ کا انجام بھی یہی ہوگا مدتوں جامعہ کی مخالفت اس بنا پر ہوتی رہی کہ یا تو اس کے کارکنوں کی نیت میں فتور ہے یا ان میں عقل کی کمی ہے یہ خیال اب اتنا عام نہیں ہے جتنا پہلے کبھی تھا تاہم ایسے لوگوں کی اب بھی کمی نہیں ہے جو جامعہ اور اس کے کارکنوں کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کی نیتوں میں خود کھوٹ ہے اور کچھ ایسے مخلص بھی ہیں جو جامعہ کی رفتار ترقی میں سیاسی ہنگاموں کی گرمی اور ہنگامہ نہ پا کر اس درجہ

مفید نہیں سمجھتے جتنی کہ وہ ہے۔

ہندوستان میں مدتوں کسی تحریک کے مفید، مبارک یا مستند ہونے کا معیار یہ رہا کہ حکومت کو اس سے کس درجہ الفت ہے اور یہی سبب ہے کہ ان تعلیمی اداروں کو قوم اور ملک سے زیادہ اعانت ملی جو حکومت کی سرپرستی میں حکومت کے مقاصد پورے کرتے رہے اور ان تحریکوں کو فروغ نہ ہوا جو ملک و قوم کے حقیقی مقاصد کو مدنظر رکھ کر حکومت کی مداخلت گوارا نہ کرتی تھیں۔ جامعہ پہلا ایسا ادارہ ہے جو حکومت کی اعانت سے مستغنی رہ کر اپنوں کی سرد مہری کے باوجود، جو اکثر شدید اور غیر شریفانہ مخالفت کی حد تک پہنچی، اپنے لیے ایک اچھی اور اونچی جگہ پیدا کر سکا!

اس درجہ تک پہنچنے میں جامعہ کے کارکنوں نے جس ایثار قابلیت اور ہمت سے کام لیا اس کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ خود حکومت جو اس طرح کی تحریکوں کو ہمیشہ شبہ کی نظر سے دیکھتی ہے، جامعہ کی طرف جھکی اور اس نے جامعہ کی درخواست کے بغیر جامعہ کے نصاب اور امتحانات کو اپنا لیا ہندوستان کی قومی تعلیمی تحریکوں کی تاریخ میں یہ پہلی مثال ہے اور جامعہ کے بہی خواہ اور کارکن اس پر جس درجہ مطمئن اور مسرور ہوں بجا ہے۔

میں کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ حکومت کتنی ہی ترقی پسند کیوں نہ ہو اس میں جامد اور غیر نامی ہو جانے کی استعداد مضمر ہوتی ہے قانون، قواعد ضوابط، روایات (جو بالعموم امتناعی ہوتی ہیں) کا اس پر اتنا بار پڑتا رہتا ہے کہ اس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت کمزور ہوتے ہوتے مفقود ہو جاتی ہے ریاست یا حکومت اپنے وجود کو قائم رکھنے کی جتنی درپے ہوتی ہے اتنا اپنے وجود کے جواز پر غور نہیں کرتی ریاست کی یہ معذوری ایک طور پر مفید بھی ہے۔ اگر ریاست نت نئے تجربے کرتی رہے تو سوسائٹی میں نہ استواری پیدا ہو نہ اعتماد لیکن اس معذوری کی دیکھ بھال نہ ہوتی رہے تو بالآخر

حکومت اس قابل نہیں رہتی کہ وہ نجی تحریکوں کو ہمدردی کی نظر سے دیکھ سکے اور رفتہ رفتہ اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ ہر نئی تحریک کو اپنا دشمن سمجھنے لگتی ہے۔ افراد یا جماعت میں نئی اور نجی تحریکوں کا پیدا ہوتے رہنا ان کی صحت و توانائی کی علامت ہے۔ دوسری طرف حکومت کی صحت و سلامتی کا معیار یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان تحریکوں سے کہاں تک ہم آہنگ رکھتی ہے اور ان کی روشنی میں اپنی صلاحیتوں و ذمہ داریوں کو پرکھتی رہتی ہے۔

جامعہ کا تعلیمی پروگرام حکومت کے مروجہ یک رخی فرسودہ پروگرام سے مختلف تھا جس کو چند باہمت اور مخلص مسلمان نوجوانوں نے قومی ضروریات اور زمانے کے مطالبات کو مدنظر رکھ کر بڑی محنت و قابلیت سے قوم اور ملک کے سامنے پیش کیا حسبِ دستور اس کی پزیرائی نہ ہوئی۔ لیکن نوجوان جو آگے دیکھنے اور جان کی بازی لگانے میں بوڑھوں سے فطرتاً زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں اپنی جگہ پر قائم رہے اور بالآخر وہ وقت آگیا جب نظام کہنہ نے بساطِ نو کے لیے جگہ خالی کرنی شروع کر دی۔ دیوانے نہ ہوں تو فرزانے کہیں کے نہ رہیں۔

ایک فاضل نے جامعہ پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ قدیم کے خلاف ردِ عمل ضرور ہے لیکن یہ ردِ عمل اتنا کافی نہیں ہے جتنا کہ ہونا چاہیئے اس نقطۂ نظر میں مغالطہ یہ ہے کہ مصنف نے اس پر غور نہیں کیا کہ جامعہ کا تعلیمی نظریہ انقلابی نہیں ہے اصلاحی ہے۔ مسلمانوں کا ایک مستقل اور مستند نظام تعلیم پہلے سے موجود تھا جس نے صدیوں ان ضروریات اور مطالبات کو بوجوہ احسن پورا کیا جن سے ہمارے پیشرو دوچار ہوتے رہے۔ گزشتہ سوڈیڑھ سو سال میں زمانہ غیر معمولی سرعت سے منقلب ہوا تو اس پروگرام میں بعض نئے اور اہم مطالبات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے چند باتوں میں اضافہ کرنا ضروری سمجھا گیا نہ یہ کہ اس نظام کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ انقلاب بہت

اچھی چیز ہی لیکن ہمیشہ اچھی چیز نہیں، مسلمان اپنے ماضی کی طرف سے بھی کچھ ذمہ داری رکھتے ہیں ذمہ داری کا ان کا یہ احساس محض جذباتی نہیں ہے بلکہ اس منصب کا تقاضا ہے ہے جس پر مسلمان فائز رہے تھے اور جس پر ان کا فائز رہنا خود انسانیت کے لیے ایک بشارت ہے۔

اس بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ جامعہ نے مسلمانوں کا جو تعلیمی پروگرام وضع کیا ہے وہ انقلابی ہو یا نہ ہو جامع ضرور ہے جس میں مسلمانوں کی تعلیمی، ضروریات، علمی روایات تمدنی برکات اور اخلاقی برگزیدگیوں کو ایک دوسرے سے متوازن اور منور رکھنے کی ماہرانہ و مجاہدانہ کوشش کی گئی ہے۔ جامعہ کسی دوسرے ادارہ کا حریف نہیں ہے بلکہ ہر ایسے ادارہ کا حلیف ہے جہاں اچھا کام ہوتا ہو جہاں اچھی باتیں بتائی جاتی ہوں اور جہاں اچھا بڑا ہو نہ کہ بڑا اچھا۔!

ذاکر صاحب کو کوئی برا کہتا ہے تو میں بھونچکا رہ جاتا ہوں۔ اس کے فوراً بعد جو بات میرے ذہن میں آتی ہے وہ یہ کہ یا تو یہ شخص شیطانِ محض ہے یا ناواقف محض! ہم میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو ذاکر صاحب سے واقف نہ ہوں اس کے بعد ذاکر صاحب کے بارے میں غیر شریفانہ خیالات رکھنا یا پھیلانا شیطنیت نہیں تو اور کیا ہے۔ کیسے یہ لوگ ہیں جو ہر چیز کو ہر چیز پر قربان کر دیتے ہیں۔

مجھے آج کم و بیش ۳۱ سال علی گڑھ میں رہتے بستے گزرے ہیں میں نے علی گڑھ کی زندگی کا ہر پہلو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ اس دوران میں جتنے لوگ طالب علمی کے مراحل سے گزرے ہیں ان میں سے سب کو نہیں تو بیشتر کو جانتا ہوں۔ اور یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے یہاں کا طالب علم اپنے عہد کے تقریباً ہر طالب علم سے کم و بیش واقف ہوتا ہے۔ میں نے آج تک یہ نہ دیکھا کہ یہاں کے جن لوگوں کی طالب علمی کی زندگی بھی رہی ہے

اس سے مختلف ان کی پبلک لائف ہو۔ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ ہر حال میں ہر جگہ ملیں گے ان کا کردار بجنسہٖ وہی ہوگا جو یہاں تھا خواہ وہ بڑے سے بڑے منصب پر فائز ہوں خواہ ادنےٰ سے ادنےٰ درجہ پر، یہ بات علی گڑھ کے سوا کہیں اور بمشکل ملے گی۔

علی گڑھ کی خصوصیت یہاں کی اقامتی زندگی ہے یونیورسٹی کی حدود سے باہر طلبار کے لیے تفریح کی کوئی جگہ نہیں۔ کوئی دریا نہیں، پہاڑ نہیں۔ باغات نہیں، پررونق بازار نہیں، تاریخی آثار نہیں، سال میں ایک بار نمائش البتہ ضرور ہوتی ہے جب طالب علم کباب پراٹھے کھاتے اور کبھی کبھار پولیس والوں کے "سراپا ناز" ہونے یا نہ ہونے کا جشن منا لیتے ہیں! اس لیے گھوم پھر کر ہر طالب علم کو فرداً فرداً مجموعی طور پر اپنی دلچسپی کا سامان یونیورسٹی کے احاطے کے اندر ہی مہیا کرنا پڑتا ہے۔ کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، ٹینس، سوئمنگ باتھ، ڈرائنگ ہال، یونین کلب، الکشن، مڈرائٹ، چارپائی الٹنا، سرسید کی فاتحہ میں جوانی کی ترنگ دکھاتے نکالتے ہیں۔

علی گڑھ میں ہر طرح کے نوجوان طلباء ہر گوشۂ ملک سے آتے ہیں۔ دن رات کا ساتھ رہتا ہے۔ ہر شخص کو خواہ وہ کسی مذاق یا میلان کا ہو اپنا رفیق و ہمدم مل جاتا ہے۔ علی گڑھ کی اس خصوصیت کا یہ اثر ہے کہ یہاں کا ہر طالب علم رفتار گفتار و کردار میں بے نقاب ہو کر رہتا ہے خواہ وہ اس کے خلاف ہی کیوں نہ کوشش کرے۔ یہی سبب ہے کہ یہاں کے ہر طالب علم کا ایک ربط نہانی علی گڑھ سے مدت العمر قائم رہتا ہے اور وہ علی گڑھ کی یاد کو اپنی زندگی کی سب سے اچھی یاد سمجھتا ہے۔ چنانچہ کسی علی گڑھ والے کو میں پبلک لائف میں پاتا ہوں تو اس کے طالب علمی کے اعمالنامہ پر نظر ڈال کر اندازہ لگا لیتا ہوں کہ وہ کیا ہے کیسا ہے۔ خواہ پبلک میں اس کے اعزاز میں نعرہ ہائے تحسین بلند کیے جا رہے ہوں، خواہ نعرہ ہائے نفرین!

ذاکر صاحب کے تین اور بھائیوں نے علی گڑھ میں تعلیم پائی، یہ خاندان تقریباً بارہ سال تک علی گڑھ کی رزم و بزم میں پورے طور بے نقاب رہا وہ بھی اس زمانے میں جب علی گڑھ اپنے طنطنہ و دبدبہ کے نصف النہار پر تھا! جب یہاں دوسرے درجے کی کوئی بات معاف نہیں کی جاتی تھی۔ اور ہر شخص کی ہر حرکت ایسی میزان میں تلتی رہتی تھی جو بڑی ہی بے درد و بے خطا تھی۔ ذاکر صاحب کے سب سے بڑے بھائی مظفر حسین خاں مرحوم اور منجھلے بھائی عابد حسین خاں مرحوم کی شرافت قابلیت اور ذہانت کا اس عہد میں جواب نہ تھا۔ چھوٹے بھائی ؟ خاں مرحوم نے فرسٹ ایر میں وفات پائی اس زمانے کے لوگ اب بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ان سے معلوم ہوگا کہ ان بھائیوں کا معاصر طلبا اور اساتذہ میں کیا درجہ اور رکھ رکھاؤ تھا۔ اور آج تک اس پایہ کے اور طالب علم علی گڑھ سے نکلے یا نہیں!

ذاکر صاحب کے سب سے چھوٹے دو بھائیوں نے ذاکر صاحب ہی کی سرپرستی میں جامعہ میں تعلیم پائی۔ ان میں ڈاکٹر محمود حسین خاں ڈھاکہ یونیورسٹی میں اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں پروفیسر ہیں ان دونوں کی زندگی بھی ہم سب کے سامنے ہے میں ان سارے بھائیوں کو جب ذہن میں لاتا ہوں تو اقبال کا یہ مشہور شعر بے اختیار زبان پر آجاتا ہے۔

وہی جوان ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
نگاہ جس کی ہو بے داغ ضرب ہو کاری

بذات خود میں سمجھتا ہوں کہ وہی شخص کھرا ہے جو علی گڑھ میں کھرا رہا اور وہ یقیناً کھوٹا ہے جو علی گڑھ میں کھوٹا تھا۔

ذاکر صاحب کے زمانے میں بھی طالب علم وہ سب کرتے تھے جو کم و بیش آج کرتے ہیں لیکن فرق یہ تھا کہ اُس زمانہ میں کوئی تحریک، یا ہنگامہ خواہ کسی قسم کے

طالب علم نے کسی بنا پر اٹھایا ہو اس کی سربراہی صرف وہ کرتا تھا جو معاصر طلباء میں اپنی قابلیت سچائی اور وقار کے لیے مشہور ہوتا۔ اس زمانہ کی روایت یہ تھی کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ ایف اے تک کا کوئی لڑکا خواہ وہ کوئی ہو کسی معاملہ میں کوئی دم نہیں مار سکتا تھا۔ تھرڈ ایر سے وہ کالج کی زندگی میں دخیل ہونا شروع ہوتا تھا۔ اگر وہ کہیں اور سے اف اے کر کے آیا ہے تو پھر اس کی حیثیت صرف نو وارد یا FRESHER کی ہوتی تھی اور اس کا رتبہ قریب قریب اف۔ اے والوں کا ہوتا اور علی گڑھ میں جو شخص باہر سے بی اے کر کے آیا وہ شاید ہی کبھی 'برادری' کا آدمی سمجھا گیا۔ ذاکر صاحب کسی ہنگامہ کے کبھی بانی نہ ہوئے لیکن ایسا کوئی موقع آجاتا تھا تو تمام طلباء متفق ہو کر انہیں کو اپنا پیشوا قرار دیتے ذاکر صاحب کی جماعت اساتذہ میں کبھی بڑی مان دان تھی اس لیے جب کبھی وہ کسی تحریک کی سربراہی کرتے تو ان کی باتوں کو وقعت دی جاتی اور طالب علموں سے اکتانے یا بیزار ہونے کے بجائے ارباب حل و عقد ان کے حقوق اور وقار کی اہمیت تسلیم کر لیتے تھے۔

۱۹۲۰ء میں ہم سب صاحب باغ میں ام اے پریوس اور قانون کے طالب علم تھے۔ قانون کے امتحان میں مشکل سے ۱۵ دن باقی تھے اور کورس سارے کا سارا کورا تھا کئی دن سے ہم لوگوں کی توجہ اس مصیبت پر مرکوز تھی۔ ذاکر صاحب کہتے تھے پڑھنا تو ہے ہی چاہے امتحان سے پہلے پڑھا جائے چاہے بعد میں۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ ناشتہ اور کھانے کا مکمل پروگرام بنا لیا جائے۔

نصیر مرحوم نے پوچھا "پروگرام سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

ذاکر صاحب نے کہا:۔

"آپ نے دو باتیں ایک ہی سانس میں کیوں پوچھ لیں۔ آپ پروگرام کے بارہ میں میری ہدایت چاہتے ہیں یا صرف مطلب دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے دونوں

ایک نہ ہوں!"

نصیر صاحب نے ذرا چیں بجبیں ہو کر کہا، "ذاکر تم پڑھائی میں کھنڈت ڈالنے آئے ہو اور اب بھی اسی کے درپے ہو۔ اچھا بتاؤ پروگرام اور مطلب میں کیا فرق ہے؟"

ذاکر صاحب نے کہا۔

"پروگرام تو عوام کے لیے بنایا جاتا ہے اور مطلب اپنا ہوتا ہے، پروگرام تو یہ بتائے گا کہ کون کون سی چیزیں کس کس وقت کھانے پر موجود ہوں گی اور مطلب یہ ہے کہ کس کو کیا اور کتنا ملے گا پر یہ بھی تو دیکھیے کھانا تو ہر حال میں ڈائننگ ہال ہی کا ہوگا لیکن پروگرام کے ساتھ کھانے سے ذرا کھانے والوں کی آبرو بڑھ جاتی ہے!"

بڑی ردوقدح کے بعد پروگرام بھی بنا اور مطلب کی بھی رعایت رکھ دی گئی۔

پڑھائی شروع ہوئی۔ ہم تین چار آدمی ساتھ پڑھتے تھے۔ ذاکر صاحب، میں، سید نصیر الدین علوی مرحوم اور خلیل الدین مرحوم۔ بحث اس پر چھڑی کہ باآواز بلند کون پڑھے۔ اس پر کوئی نہیں تیار ہوتا تھا۔ نصیر مرحوم ہکلاتے تھے ان کو پڑھنے سے معاف کر دیا گیا تھا اور بحث کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ خلیل مرحوم پڑھنے سے شرماتے تھے۔ ان کا کالج کا نام بھی گلفام ہے۔

میں نے کہا "میں پڑھنے کے لیے تیار ہوں لیکن پھر ذاکر صاحب نے قائم گنج سے جو گھی منگوایا ہے وہ دوپہر اور شام کو دال میں ڈالنے کے لیے دو چمچے زائد لوں گا۔"

نصیر صاحب طیش میں آکر بولے "..... ہر..... ہر..... ہرگز..... نہیں ..... میں..... پ پ پ..... پڑھوں گا"

میں نے کہا "تو پھر تین چمچے لوں گا۔"

ذاکر صاحب بولے "وہ کیوں"

میں نے کہا، "نصیر صاحب پڑھیں گے تو مجھے ایک چمچہ سر میں بھی ڈالنا پڑے گا۔"

ذاکر صاحب نے کہا "پڑھنے کو تیار ہوں لیکن صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آپ سب سے تین منٹ پہلے کھانا شروع کر دوں گا۔ اس کے بعد آپ لوگ شروع کریں۔" اس پر ہر شخص بیک وقت چیخ پڑا اور بولا "ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ ہم پڑھنے کے لیے آئے ہیں بھوکوں مرنا نہیں چاہیے!"

غرض پڑھائی شروع ہوئی۔ علوی مرحوم اور ذاکر صاحب میں کبھی کبھی قانونی نکتوں پر بڑے لطف کی اور بڑے زور شور کی بحث ہو جایا کرتی تھی ایک دفعہ بحث طوالت پکڑ گئی تو علوی مرحوم نے جھنجھلا کر کہا "اس قانون کو بنانے وقت واضع نے غالباً آپ سے مشورہ کر لیا تھا۔"

ذاکر صاحب نے فرمایا "اس نے تو مشورہ نہیں کیا لیکن آپ کو میرا مشورہ یہی ہے!" اس جملہ پر مرحوم کا فرط مسرت سے ناچنا کودنا اور قہقہے لگانا اب بھی یاد آتا ہے۔ صاحب باغ ہی میں ایک صاحب اور تھے جو اپنے آپ کو بڑا قانون داں گردانتے تھے اور قانونی بحثوں میں ہمیشہ کسی نہ کسی ہائی کورٹ کی جدید ترین نظیر پیش کر دیا کرتے تھے۔ ان کے چہرہ بشرہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی نظیر آسمان سے نازل ہونے والی ہے یا اللہ تعالےٰ نے ان کا رتبہ خاطر میں لائے بغیر ان کو دنیا میں بھیج دیا۔ یہ رات بھر تو قانون پڑھتے تھے۔ اور دن بھر پڑھنے والوں کے ہاں باری باری پہنچ کر یا تو اونگھتے تھے یا ہر شخص کی قانونی سمجھ کو ہیچ پوچ ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ رہم لوگوں میں بھی آ بیٹھتے تھے، ان کے آ جانے سے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ لیکن ذاکر صاحب سب چھوڑ چھاڑ ان کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ اس کا سبب کچھ تو یہ تھا کہ یہ اس فکر میں رہتے تھے کہ کسی طرح پڑھنے کا سلسلہ ٹوٹے اور کچھ اس سبب سے کہ ذاکر صاحب کو سر پھرے احمقوں سے یوں بھی بڑی الفت تھی اور ان کے ہاں میں ہاں ایسی ملاتے تھے اور اپنی طرف سے ایسی ایسی گڑھتے تھے کہ کوئی ناواقف دیکھے تو ذاکر صاحب کو معلوم نہیں کیا کہے

میں نے ایک دن کہا "ذاکر صاحب اس غریب پر رحم کیجیے اس پر نہیں تو اس کے والدین یا اس کی آئندہ ہونے والی بیوی بچوں پر ترس کھائیے۔ ساری منزلیں تو یہ خود طے کر چکا ہے یہ آپ سہارے دے دے کر اس کو تباہی کے گڑھے میں ہمیشہ کے لیے کیوں گراتے ہیں۔ ایک روز ہم سب بڑے انہماک اور لطف سے پڑھائی میں مصروف تھے کہ یہ آن پہنچے۔ اس دفعہ ذاکر صاحب بھی کسی قدر منغض ہوئے، حسب معمول نووارد نے ایک موقع ڈھونڈھ نکالا اور نکتہ چینی شروع کر دی گفتگو ہوتے ہوتے یہاں تک پہنچی کہ نووارد نے کہا "ذاکر صاحب معاف کیجیے گا آپ اچھی وکالت تو کر سکتے ہیں لیکن جج یا واضع قانون ہونا بالکل دوسری بات ہے"۔

ذاکر صاحب نے کہا "یہ آپ واقعہ بیان کر رہے ہیں یا بشارت دے رہے ہیں"۔ انھوں نے ایک ہلکے سے زہر خند کے ساتھ فرمایا۔ "دونوں" ذاکر صاحب نے جواب دیا۔ "میں واضع قانون ہوتا تو آپ یقین فرمائیں آپ دنیا میں سب کچھ کرنے پاتے قانون پڑھنے نہ پاتے اور میں جج ہوں گا تو آپ کو معذور قرار دے کر آپ کے لیے ہمیشہ عدالت یا حکومت کے خرچ پر کوئی معقول وکیل مقرر کرا دیا کرواؤں گا۔" علوی مرحوم نے اچھل کر نووارد کو گود میں لے لیا اور ان کی ناک کان آنکھ اور گردن کے ہیکلا ہر کلا کر اتنے بوسے لیے اور ان کو گود میں لے کر اس طرح ناچے کہ سارا صاحب باغ اکٹھا ہو گیا۔ نووارد نے دوسرے دن بورڈنگ ہاؤس بدل دیا!

ہمارے کمرے صاحب باغ کی دوسری منزل پر شرقی سمت واقع تھے۔ سامنے برآمدہ تھا، برآمدے سے اتر کر لمبا پتلا صحن جہاں ہم سب بیٹھے پڑھنے میں مصروف تھے۔ رات زیادہ آچکی تھی۔ سامنے درختوں کے تاریک گڈمڈ ہجوم کے ٹھیک اوپر چاند برآمد ہو رہا تھا۔ سب کی نظر یک بیک چاند پر پڑی جو اس درجہ خاموش خوبصورت،

الگ تھلگ اور حزیں نظر آیا کہ سب کے سب تھوڑی دیر کے لیے دم بخود ہو گئے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نامعلوم قوت نے یک بہ یک ہمارے حواس سلب کر لیے ہوں اور ہم کو ہمارے گرد و پیش سے اٹھا کر ایسے عالم میں پہنچا دیا ہو جہاں جسم و جان صرف احساسِ حسن و سیرت میں جذب ہو کر رہ گئے ہوں۔

ذاکر صاحب کتاب پر جھکے ہوئے تھے۔ دونوں کہنیاں میز پر تھیں اور ہاتھوں کی دو دو انگلیوں سے آنکھوں کے پپوٹے یوں کھولے ہوئے تھے جیسے "بادام" کے عوض آنکھیں نکال کے بھیجنے والے تھے۔۔

میں نے کہا "ذاکر صاحب یہ کیا؟ ذرا چاند کی طرف دیکھیے گا۔"

کہیں سے جنبش کھائے بغیر بولے۔

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں

ثاقب لکھنوی کی ایک غزل علی گڑھ کے مشاعرہ میں پڑھی گئی تھی جس کا یہ شعر بہت مقبول ہوا اور ہر شخص کی زبان پر تھا ملاحظہ فرمائیے۔

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں

ابرِ بہار جانبِ کہسار دیکھ کر

سب ہنس پڑے اور منظر کا سحر کافور ہو گیا۔

علوی صاحب نے پوچھا "ذاکر آخر یہ ہے کیا؟"

کہنے لگے "نہ نیند مانتی ہے۔ نہ آپ مانتے ہیں۔ کروں کیا۔۔ نیند آتی ہے پر نہیں جاتی!"

دوسرے ہی دن طالب علموں کا ایک ہجوم صاحب باغ پہنچا معلوم ہوا کسی مسئلہ پر طلباء نے اجتماعی طور پر احتجاج کیا ہے اور ذاکر صاحب سے درخواست کرنے آئے ہیں کہ وہ اس کی سربراہی کریں۔ ذاکر صاحب فی الفور ان کے ساتھ روانہ ہو گئے تین چار دن تک ان کا کوئی پتہ نہ چلا۔ ایک دن یونین کے دارالمطالعہ میں مل گئے۔

میں نے پوچھا "کیسی رہی ؟"

بولے۔ "بخیر گزشت"۔

میں نے کہا "اور جناب پڑھائی ؟"

فرمایا "اس ہنگامے میں جو دل و جان سے منہمک رہا۔ اس کا کچھ تو اجر ملنا چاہیئے تھا اللہ نے آپ سے نجات دلائی"۔

"اور کھانا پینا" میں نے پوچھا۔

بولے۔ "قوم کا کام کرنے والا بھوکا نہیں مرتا"۔

میں نے کہا "ذرا احتیاط رکھیے گا قومی کام کرنے والے بھوک سے تو نہیں مرے لیکن ہیضہ میں اکثر مرے پائے گئے ہیں"۔

میں بدحظ ہو کر چلنے لگا تو لپک کر سامنے آ گئے۔ کہنے لگے "للہ میرا کہا مان لیجئے"۔

میں نے کہا "وہ کیا ؟"

فرمایا۔ "چلئے دہلی چلیں"۔

میں اکتا گیا۔ اور بولا "ذاکر صاحب ہوش میں آیئے امتحان کے دن رہ گئے ہیں"۔

اس بات کو اس طور سے ٹال گئے جیسے اس کی ذرہ برابر بھی اہمیت نہ تھی۔ کہنے لگے "پڑھ کے کیا کیجئے گا کھانے کمانے بھر کا پڑھ لیا ہے۔ احمقوں کو مرعوب کرنے کے لیے بی اے کافی ہے۔ بھلے مانسوں میں بیٹھنے کے لیے ہنسنے بولنے کی عادت ڈالنی ہے۔ اس کے لیے دہلی کا سفر ضروری ہے"۔

میں نے کہا "اور سفر خرچ کہاں سے آئے گا ؟"

بولے ـــــ "اس کی پروا نہ کیجیے۔ خالو صاحب کو لکھ دیا ہے۔ کالج میں دق کی شکایت پھیل گئی ہے۔ کچھ گھی اور روپے بھیج دیجیے۔ گھی تو پہلے آ گیا۔ روپیہ آن آیا ہے بس دلی چلے چلیے، شاہجہاں پوری والے کے ہاں ڈٹ کر کھانا کھایا جائے گا۔ ہندوستانی

دواخانہ سے دوائیں خریدی جا سکتی ہیں، رات کو واپس آجائیں گے۔"

میں نہ مانا، ذاکر صاحب بھی دلی نہ گئے صرف کالج میں جہاں تہاں کھاتے یا گپ کرتے پائے گئے امتحان سے تین چار دن پہلے صاحب باغ کی اُفق پر پھر سے نمودار ہوئے ہم نے ان کی پذیرائی اس طور پر کی جیسے وہ سب کچھ کھو آئے تھے اور ہماری ہمدردی کے مستحق تھے۔ اور وہ اس طور سے ملے جیسے انھوں نے ہمارے گناہوں کو معاف کر دیا ہو۔

امتحان ہوا۔ نتیجہ نکلا۔ ہم سب فیل۔ صرف ذاکر صاحب پاس!

زندگی میں مجھ پر اکثر ایسا وقت آیا ہے جب دل میں یہ بات آئی کہ قابلیت اور قربانی کا نتیجہ کیا جب ان کو نظر انداز کر کے دنیوی منفعت سے بہرہ وافر مل سکتا ہے۔ دنیا میں کیسے کیسے گھٹیا لوگ کیسے کیسے اعلیٰ مناصب پر فائز ہیں کوئی ان کو بُرا کہہ کر ان کا کیا بگاڑ لیتا ہے۔ محتاط اور ایماندار رہنا اچھا ہی لیکن آخر ان لوگوں کا بھی تو خیال رکھنا ہے جو میری ذات سے وابستہ ہیں میرے بعد ان کا کیا حشر ہوگا تھوڑا سا گھٹیا پن کر لینے میں کوئی ہرج نہیں فراغت نصیب ہوگی تو اس کی تلافی تھوڑا بہت دے دلا کر کر دیں گے پھر بھی بہت کچھ بچ رہے گا دیکھتے نہیں نامعقول اہل مناصب بھولے سے بھی کوئی بھلائی کر دیتے ہیں تو کوئی نہیں بھولتا اور ایماندار و مخلص جسے دولت و شہرت نصیب نہیں تمام عمر دوسروں کے لیے مصائب جھیلتا ہے لیکن اس کی خوبیوں پر اکّا دکّا کبھی کبھار صرف ہوں ہاں کر کے رہ جاتے ہیں اور اکتا کر اس کی یاد سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔ اس دنیا میں لوٹ کر آنا نہیں ہے پھر اس کی لذتوں سے محروم رہنا کون سی عقلمندی ہے، وہ بھی لذتیں جب کچھ دور نہ ہوں آسانی سے ملتی ہوں اور رسوائی کا کچھ ایسا امکان بھی نہ ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میں بزدل ہوں اس لیے بُرائی سے ڈرتا بھاگتا ہوں!

اس کیفیت کا ردّ عمل ہوتا ہے۔ اور میرے سامنے ذاکر صاحب آجاتے ہیں

میں اُن بڑی ہستیوں سے بہتوں سے زیادہ واقف ہوں، جن کی خوبی، نیکی اور بہادری سے مذہب تاریخ یا افسانوں کے اوراق لبریز ہیں ان کی شہرت یا برگزیدگی کو میں مانتا ہوں۔ اس وجہ سے نہیں کہ ان کا اصلی یا فرضی وجود کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شکل میں ملتا ہے بلکہ اس کی جھلک مجھے اپنے دوستوں میں ملتی ہے ان دوستوں میں جن کی زندگی کے ہر پہلو سے میں پورے طور پر آشنا ہوں جن کو میں دنیا کے ہر کاروبار میں اسی طرح منہمک پاتا ہوں جس طرح میں خود ہوں جن کے سامنے وہی کمزوریاں یا لذتیں آتی ہیں جو میرے سامنے آتی ہیں وہ ان کو مسکرا کر (ڈر کر نہیں) نظر انداز کر دیتے ہیں ان کمزوریوں سے میرا سابقہ ہوتا ہے تو میں علانیہ یا چھپ کر ان میں مبتلا ہو جاتا ہوں اور طرح طرح کے جتن کرتا ہوں اور نظر انداز کر دیتا ہوں تو تمام عمر ان کو حسرت سے یاد کرتا رہتا ہوں لیکن وہ دنیا کو نہ دارالمحن سمجھتے ہیں نہ دار فانی، اس کو صرف دنیا سمجھتے ہیں۔ ایسی دنیا جس کو وہ آخرت سے بھی اعلیٰ و ارفع بنانے کے لیے حوصلہ رکھتے ہیں۔

مجھے اطمینان ہونے لگتا ہے کہ میں نے اپنے لیے جس زندگی کا انتخاب کیا ہے اس میں خسارہ نہیں ہے۔ میرا جن لوگوں کا ساتھ ہے وہ برے نہیں ہیں زندگی کا ماحصل یا انسانیت کا مقصد یہی نہیں ہے کہ آدمی نے جو زندگی یا زمانہ پایا اس کو اپنے حسنِ خیال یا حسنِ عمل سے خواہ وہ اتنا کم ہو کہ حساب میں نہ آئے بہتر و برتر بنائے۔ دنیا کو بہتر و برتر بنانے کے لیے لازم ہے کہ انسان خدمت لینے سے زیادہ خدمت کرے۔ یہ وہ عبادت ہے جو اس کو نفس کے تمام ناروا مطالبات سے باز رکھتی ہے اور مسرور و مطمئن بناتی ہے ہر وہ بات اور ہر وہ فعل جو انسان کو اس عبادت سے باز یا محروم رکھے ظلم یا گناہ ہے! انسان مال یا کھال ہی میں مست نہیں رہتا کردار میں بھی مست رہ سکتا ہے!

ذاکر صاحب وہ سب کر سکتے تھے اور پا سکتے تھے جو آج کل کے ہمارے بڑے آدمیوں کو نصیب ہے۔ ان کو بڑی سے بڑی نوکری مل سکتی تھی، وہ عوام کو بہکا کر

یا بھڑکا کر شریفوں پر دنیا تنگ کر سکتے تھے وہ رشوت لے یا دے کر دولت و اقتدار حاصل کر سکتے تھے خدا اور رسول کے نام پر خانقاہیں یا یتیم خانے قائم کر کے غریبوں کی کمائی اور ناموس لوٹ سکتے تھے، وہ ہر طرح کے فسق و فجور میں مبتلا رہ کر بھی اپنی قوم کے آخری نجات دہندہ قرار دیے جاتے۔ ذاکر صاحب کی ذہنی استعداد جس پایہ کی ہے اس سے ان کے بدترین دشمن بھی انکار نہیں کر سکتے۔ وہ اس استعداد کو اپنے نفس کی خاطر بے لگام کر کے وہ تمام باتیں حاصل کر سکتے تھے جن کو ہم رشک و حسرت کی نگاہ دیکھتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک دن وفات پا جاتے ہیں! نفس کے اس بے پناہ عفریت کو جس کے ادنیٰ اشارے پر ہم اپنی ہی نہیں دوسروں کی بھی قیمتی سے قیمتی متاع تلف کر دینے پر آمادہ رہتے ہیں اور اسے نصیبے کی یاوری یا قوم کی بیداری سمجھتے ہیں۔ ذاکر صاحب نے کس طرح زیر کیا اور کیوں کیا اسے کون سمجھے گا اور کیوں سمجھے گا، جب اس کے سمجھنے سے نجس مقاصد اور ملعون نیتیں بے نقاب ہوتی ہوں!

ذاکر صاحب نے سب سے الگ ہو کر لیکن سب کے لیے جامعہ کی بنیاد ڈالی۔ محنت سہی، بے کسی دیکھی، گالیاں سنیں، رسوائی اٹھائی، انتظار جھیلا لیکن منھ نہ توڑا۔ مسکرانے سے باز نہ آئے، دشمن سے نہ ڈرے نہ اسے دھتکارا، اس نے مانگا تو دے دیا، اس نے چرایا تو جانے دیا، خود سہتے رہے جامعہ کو سپر نہ بنایا، اس کو صرف سنوارا۔ وہ انتظار کرنے سے گھبرائے نہیں۔ اس لیے کہ اچھے اور بڑے کام کرنے میں انتظار کی منزل سرے سے مفقود ہوتی ہے، انجام کا ڈر نہیں ہوتا۔ کام و انجام ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ انجام یا انعام کا وہ یاوہ ہوتا ہے جس کو اپنے کام پر نہ ایمان ہو نہ اطمینان، سب سے بڑا اور سب سے اچھا انعام وہ ہے جو ہم خود اپنے آپ کو دے سکیں نہ وہ جو دوسرے سے ملے۔

بعض دوستوں کا خیال ہے کہ جامعہ کا پروگرام لمبا ہے۔ اس کے نتائج دیر میں،

برآمد ہوں گے۔ ملک کے حالات اس کے مقتضی ہیں کہ سیاسی سرگرمیوں میں جلد سے جلد حصہ لیا جائے۔ اس سے جہاں اور فوائد ہیں، وہاں جامعہ کے کاموں کو بھی تقویت پہنچے گی۔ ملک و قوم کی حالت روز بروز دگرگوں ہو رہی ہو تو بلیے پروگرام کو اپنی توجہ و محنت کا تنہا مرکز بنانا مناسب نہیں۔

لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ سیاسی سرگرمیاں بجائے خود کوئی اہمیت نہیں رکھتیں ان میں صحت اور استواری اسی وقت آتی ہے جب ان کی آبیاری کے لیے ہمارے ذہنوں میں صاف اور شفاف پانی کے گہرے اور نہ سوکھنے والے سوتے ہوں یہ سوتے تعلیم ہی سے منکشف بھی ہوتے ہیں اور پیدا بھی۔ بازاروں اور اخباروں میں تو ہیں بنتی نہیں بدنام ہوتی ہیں۔ تعلیم کو سیاست پر قربان کرنا تنگ نظری اور خود غرضی ہے۔ سیاست کو تعلیم کی باندی ہونا چاہیے۔ تعلیم میں نتائج کی دیر سویر بے معنی سی بات ہے

اونچے درجے کی تعلیم گاہوں میں معلم اعلیٰ کی حیثیت جس کے سپرد ادارہ کا نظم و نسق بھی ہو دوسرے اداروں کے افسروں کی حیثیت سے بالکل علیحدہ اور مختلف ہوتی ہے۔ تعلیم گاہوں میں ایسے عہدہ کی حیثیت منصبی نہیں ہوتی، علمی، ذہنی اور اخلاقی ہوتی ہے۔ یونیورسٹیوں میں اونچے درجے کا علمی و تعلیمی کام ہوتا ہے۔ یہاں کا ہر معلم اپنے فن کا امام ہوتا ہے۔ خواہ اس کا عہدہ یا اس کی تنخواہ کتنی ہی کم کیوں نہ ہو۔ ایسی صورت میں لازم آتا ہے کہ افسر اعلیٰ کا ذہنی اور آخری درجہ اپنے ماتحتوں یا ساتھ کام کرنے والوں کے علمی و اخلاقی درجہ سے واضح طور پر بلند نہ ہو تو کم درجہ کا کسی طرح نہ ہو۔ ایسی تعلیم گاہوں میں منصب دولت، امارت، رسوخ کی کوئی اہمیت نہیں۔ برخلاف سرکاری اداروں کے جہاں منصب ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ کلکٹر ہزار نااہل ہو اور تحصیلدار کیسا ہی قابل کیوں نہ ہو، ہر حال میں اول الذکر ہی کا بول بالا رہے گا

یونیورسٹیوں میں علمی اور ذہنی صلاحیتوں کا مقابلہ صرف علمی و ذہنی صلاحیتوں سے ہوتا ہے زور بازو سے کام نہیں چلتا۔ یہاں زور بازو یا دغل فضل سے کام لینا نری حماقت ہے جس کو بڑے سے بڑا معاف کرنے والا بھی معاف کرنے پر آمادہ نہ ہوگا۔

ذاکر صاحب جامعہ کو پچیس سال سے چلا رہے ہیں۔ اس دوران میں جامعہ اور جامعہ میں کام کرنے والوں کو طرح طرح کی مصیبتیں جھیلنی پڑیں دونوں پر مسلسل اور بے پناہ غیر شریفانہ حملے ہوئے لیکن نہ یہاں کوئی اسٹرائک ہوئی نہ کوئی بددل ہوا نہ جامعہ کو چھوڑ کر شہرت یا روزی کمانے کہیں اور گیا۔ یہاں ایسے لوگ بھی نہ تھے جن پر رزق اور موت کے دروازے بند رہے ہوں اور جامعہ کے علاوہ کہیں اور ٹھکانا نہ ہو بلکہ ان میں سے اکثر اپنے علم و فضل کے اعتبار سے ایسی شہرت رکھتے تھے کہ ہندوستان کی بڑی سے بڑی یونیورسٹی میں ان کی پذیرائی احترام کے ساتھ ہو سکتی تھی۔ یہ صرف ذاکر صاحب کی بلند و برگزیدہ شخصیت تھی جس نے جامعہ کے تار و پود کو نہ صرف بکھرنے سے بچایا بلکہ اس کو مربوط و مستحکم کر دیا۔

جامعہ کا ہر چھوٹا بڑا ہمہ وقت یہ دیکھتا تھا کہ وہ خود کیا ہے اور کیا کر رہا ہے اور ذاکر صاحب کیا ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ سارا قضیہ اسی ترازو میں تل کر ختم ہو جاتا۔ ذہنی قابلیت میں جو شخص اپنے آپ کو بڑا سمجھتا تھا۔ ذاکر صاحب کی ذہنی قابلیت کے سامنے سر جھکا دیتا۔ اپنے ایثار، قربانی اور اخلاقی فضائل کا کسی کو خیال آتا تو وہ بیپاتا کہ ان فضیلتوں میں بھی ترازو کا پلڑا ذاکر صاحب کی طرف جھکتا ہے۔ خاندانی شرافت و نجابت یا سوشل یا سرکاری تعلقات یا رسوخ پر کسی کو ناز ہوتا تو وہ یہ پاتا کہ ان کا سردار خاندانی اعتبار سے بھی زر خالص ہے اور اس کے تعلقات بھی زیادہ وقیع زیادہ مستحکم اور زیادہ وسیع ہیں۔ محنت کرنے اور فرائض سے عہدہ برآ ہونے کو دیکھتا تو معلوم ہوتا کہ ذاکر صاحب جیسا محنت شاقہ کرنے والا اور اپنے فرائض پر آرام و تفریح کو

قربان کر دینے والا حلقہ میں ان جیسا کوئی اور نہ تھا کسی کو اپنے ذوق، ذہانت و فطانت کا دھیان ستاتا تو وہ دیکھتا کہ اس وادی میں بھی امام ذاکر صاحب ہی ہیں۔ کلرک یہ دیکھتا کہ ذاکر صاحب اس سے زیادہ کلرکی کرتے ہیں۔ چپراسی یہ پاتا کہ ذاکر صاحب اس سے زیادہ دوڑ دھوپ اٹھاتے ہیں اور چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اپنے ہاتھ سے کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں بچہ یہ دیکھتا کہ ذاکر صاحب جیسا بچہ کوئی نہیں، جوان یہ محسوس کرتا کہ ذاکر صاحب اس سے زیادہ جوان ہیں اور بوڑھا یہ دیکھتا کہ جب بڑھاپا ذاکر صاحب کے قریب جانے سے ڈرتا ہے تو پھر وہ بڑھاپے کو کیوں خاطر میں لائے۔

ان کے علاوہ ہر شخص کا عقیدہ تھا کہ ذاکر صاحب دوسروں کے فائدہ کے لیے جان کھپاتے ہیں، اس کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد اور اس کی عزت و فراغت کو اپنی عزت و فراغت سمجھتے ہیں تو پھر کون ایسا ہو سکتا تھا جو ذاکر صاحب کو چھوڑ کر اپنے ضمیر کی سرزنش گوارا کرتا۔

یونیورسٹی میں اچھے اور ذہین طلبا سے ملنے، اور ان کے ساتھ طبع آزمائی کرنے میں جو لذت ہے وہ مجھے کسی اور چیز میں نہیں ملتی۔ اس سے خود طالب علم کو کوئی فائدہ پہنچتا ہو یا نہیں میں نے ہمیشہ فائدہ اٹھایا، زندگی کی بعض قباحتوں یا روز روز کی یکسانیت سے جب طبیعت منغض یا پست ہونے لگتی یا یہ دیکھتا کہ کہنگی اور تھکن میری طرف رینگتی بڑھتی آ رہی ہے تو مجھے یہ ضرورت محسوس ہوتی کہ کسی اچھے اور ذہین طالب علم سے گفتگو کی جائے اس وقت صحیح اندازہ ہو سکے گا کہ میں واقعی حق بخشوا چکا ہوں یا

اب بھی گر پڑ کے ضعف سے نالے ساتواں آسمان لیتے ہیں!

گفتگو کے دوران ہی میں مجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ "غریب نیستم بیمار ہستم"

لہ کابل کے ایک افغان سوداگری کے سلسلے میں ہندوستان کی ایک سرائے میں ٹھہرے ہوئے تھے

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اچھی کتاب پڑھنے اور اچھے طالب علم سے گفتگو کرنے کے بعد میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ ذہن میں بالیدہ ہونے پرواز کرنے اور نئی سے نئی وادیوں سے گزرنے کی استعداد باقی ہے اور دل و دماغ پر تاریکی کے جو بادل چھا گئے ہیں وہ عارضی ہیں دائمی نہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ مجھ میں ایک صفت یہ بھی ہے کہ میں بالعموم ایسے طالب علم کی تلاش میں نہیں رہتا اور خود ایسے طالب علم کے ہاتھ نہیں آتا۔ اس لیے کہ اقبال کے زمانہ تک تو نوجوانوں کے اعصاب پر عورت سوار تھی۔ میرے زمانہ میں سواری یا کرایہ سستا پاکر ان پر تسمہ پا لیڈر بھی سوار ہو گئے۔ مجھ میں نہ اتنی سکت کہ میں اس تگڈم کو اپنے اوپر سوار کر لوں دوسری طرف انسانیت گوارا نہیں کرتی کہ میں خود ان پر سوار ہو جاؤں۔

میں اپنے اچھے اور صاحب توفیق طالب علم کو اکثر یہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ کبھی نہ کبھی ذاکر صاحب سے مل ضرور آئے اور یہ اس لیے کہ میں جس متاع کو اپنے لیے گرانمایہ سمجھتا ہوں اس میں اپنے ان عزیز طلبا کو بھی شریک کر لینا چاہتا ہوں جن کو عزیز سمجھتا اور محترم گردانتا ہوں۔ بحیثیت ایک معلم کے میرا عقیدہ ہے کہ نوجوانوں کو جتنی صحیح و صالح تربیت بلند و برگزیدہ شخصیتوں سے ملتی ہے اتنی کتابوں اور لکچر سے نہیں ملتی۔ مطالعہ سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے جو بے کار بھی ہو سکتی ہیں اور خطرناک بھی اگر

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) اتفاق سے بیماری نے صاحب فراش کر دیا۔ تمام دن چارپائی پر پڑے رہتے تھے اور بھٹیاری کچا پکا جو کچھ سامنے رکھ دیتی تھی اسے فرو کر لیا کرتے تھے بھٹیاری دوسرے مسافروں کا بھی کھانا پکاتی تھی اور حسب دستور قدیم کسی کا آٹا کم کر دیا کسی کی روٹی اڑا دی کسی کی بوٹی غائب کر دی۔ اس پر مسافروں سے بھٹیاری کی چخ چخ ہوتی ایک دن بھٹیاری نے ان کو مخاطب کر کے کہا تم لوگ کیسے بڑے ہو کہ جینے نہیں دیتے۔ ایک ان غریب کو دیکھو کہ دن بھر چپ چاپ پڑے رہتے ہیں جو سامنے رکھ دیا شکر کر کے کھا لیا۔ خان سے نہ رہا گیا لیٹے ہی لیٹے للکارا "قطار ما غریب نیستم بیمار ہستم"!

کوئی بڑی شخصیت ان معلومات کو اس طالب علم کے لیے مفید مطلب نہ بنا دے۔

معلومات کی مثال ریگ صحرا سے بھی دی جا سکتی ہے اور پھک سے اڑ جانے والے مادہ سے بھی، یہ کام صرف اچھے معلم یا رہبر کا ہے کہ وہ ذرہ سے الماس نکال دینے کی اور بارود سے تباہی کا امکان دور کر کے مفید طاقت حاصل کرنے کی سبیل بتائے۔ کچھ دنوں سے نوجوانوں میں جو بے راہ روی نظر آ رہی ہے اس کے اسباب بہت کچھ ہو سکتے ہیں لیکن ایک بات جو مجھے نہایت واضح طور پر نظر آئی وہ یہ ہے کہ طلباء کو زیادہ سے زیادہ اور انواع و اقسام کی معلومات فراہم کرنے کی خطرناک حد تک سہولتیں میسر ہیں۔ لیکن ان معلومات کو ان کے لیے مفید بنانے یا ان کی گزند سے بچانے والے اچھے معلم یا رہبر نہیں ہیں۔ صاحب نظر کے ادنیٰ اشارہ سے وہ منزلیں چشم زدن میں طے ہو گئی ہیں جو نظروں سے پوشیدہ رہی ہیں یا جن تک پہنچنے میں صدہا دشواریاں خطرے اور مایوسیاں تھیں

طالب علم ذاکر صاحب سے مل کر آتا ہے تو ان کے اور جامعہ کے بارے میں ایسے خیالات و تاثرات کا اظہار کرتا ہے جیسے زندگی میں اسے کوئی اچھی اور غیر متوقع چیز مل گئی ہے۔ ذاکر صاحب نے ان طلبا سے مذہب اور سیاست پر کبھی گفتگو نہ کی وہ کہتے تھے کہ ان مباحث پر مولوی اور لیڈر بحث کرنے کے لیے کیا کم ہیں۔ میں تو صرف یہ دیکھتا ہوں کہ طالب علم کے قویٰ ذہنی کس نوعیت کے ہیں اس کے ذہن و اخلاق میں کس نوعیت کا ربط ہے اس نے کیا پڑھا ہے، کن چیزوں سے متاثر ہے، اس میں کیا صلاحیتیں پوشیدہ ہیں وہ اپنی صلاحیتوں کے بس میں ہے یا ان صلاحیتوں کو اپنے بس میں رکھ سکتا ہے۔ اس پر میں اپنا ٹھپا نہیں لگاتا بلکہ اس کو اپنا ٹھپا متعین کرنے میں اس کی مدد کرتا ہوں اور میں جانتا ہوں۔ مرشد کا "کھل سم سم" یہی ہے!

جامعہ کو دیکھنے کے لیے بڑے سے بڑے ماہرین تعلیم اور مبصرین فن وقتاً فوقتاً

آتے رہتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اس کے بارہ میں اچھے سے اچھے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ ایک دن میں نے ذاکر صاحب سے پوچھا "کیوں مرشد یہ جتنے غریب جامعہ کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں ان کو ساری چیزیں دکھاتا بتاتا کون ہے؟" فرمایا "بالعموم میں ہی ہوتا ہوں"۔

میں چپ ہو گیا۔ "ذاکر صاحب چونکے اور پوچھنے لگے۔" اس سوال کا مقصد کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "کوئی مقصد نہیں، بقول آپ کے میں نے یہ بات محض معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے پوچھ لی۔"

ذاکر صاحب نہ مانے اور بولے۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ کے ذہن میں حسب معمول کوئی فتنہ بیدار ہوا ہے۔ آپ کو بتانا پڑے گا۔"

میں نے کہا۔ "مرشد بات کوئی نہیں ہے۔ آپ سے صرف یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ کبھی بہرائچ گئے ہیں؟"

بولے۔ "نہیں"۔

میں نے کہا۔ "خیر آپ نے غازی میاں کا میلا تو دیکھا ہو گا۔"

بولے۔ "جی میں نے دیکھا ہو یا نہیں آپ اپنا مطلب سنائیے۔"

میں نے کہا۔ "ارے وہی جہاں ڈفالی لہک لہک کر گاتے پکارتے ہیں!

اندھے پائیں گے چشم (چشم) کوڑھی پائیں گے شریر (جسم)

میاں سے مرادی مانگ لے!

ذاکر صاحب فرطِ انبساط سے اچھل پڑے اور بولے، کیا غزل سنائی ہے جھک ماریں تمام دنیا کے شاعر مصلح اور لیڈر اس کے آگے۔ تھوڑی دیر تک اس پر گفتگو رہی اس کے بعد بولے، "لیکن اس بندا کی خبر تو سنائیے۔"

میں نے کہا۔ "مرشد میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ اگر آپ کے ساتھ غازی میاں کے

میلے میں دنیا کا بڑے سے بڑا مفکر ہو اور آپ ذرا جی لگا کر اُسے یہ بتا دیں کہ یہ میلہ نہیں ہے بلکہ اقوام عالم کی پارلیمنٹ ہے جہاں مفکرین و مصلحین اعظم متفق و متحد ہو کر انسانیت کو اوج سعادت و کامرانی پر فائز کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں تو وہ بے چون و چرا تسلیم کرے گا اور تمام عمر اپنی قسمت پر ناز کرے گا کہ آپ کے توسل سے وہ دنیا کے سب سے نئے سب سے بڑے اور سب سے مبارک تجربہ سے آشنا ہوا۔"

مرشد نے اس کے بعد کیا کہا اور مجھے کیا سننا پڑا کاش ہم میں سے ہر ایک سنتا لیکن وہ باتیں ایسی نہیں ہیں جو ہر کس و ناکس کو بتائی سنائی جائیں ہیں البتہ بہت خوش ہوا کہ میرا مقصد پورا ہوا یعنی مرشد پر جلال طاری ہوتا ہے تو کیا ہوتا ہے۔

اس تمام داستان کے لکھنے کے بعد مجھے اپنے عزیز و محترم دوست کی تنبیہ یاد آئی، ذاکر صاحب پر میں نے وقتاً فوقتاً جو کچھ کہا اس پر میرے ان دوست نے ایک بار مجھ سے کہا۔ "آپ ذاکر صاحب کے بارے میں یہ کیا اناپ شناپ لکھ ڈالتے ہیں۔ ان کے وقار کا تو لحاظ رکھا کیجیے۔ لوگ ان کے بارہ میں کیا خیال کریں گے آپ تو تفریح کی سوجھتی ہے لیکن ذاکر صاحب کی رسوائی ہوتی ہے!"

میں نے عرض کیا۔ "آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر لیکن آپ سے یہ شکایت ہے کہ آپ نے ذاکر صاحب کے وقار کا تو لحاظ رکھا اور میرے وقار کو بالکل نظر انداز کر دیا آپ کے بارے میں تو مجھے معلوم نہیں کہ آپ ذاکر صاحب کے وقار کو کن باتوں پر مبنی سمجھتے ہیں میرے نزدیک تو ان کا وقار انھی باتوں پر مبنی ہے جو میرے ذہن و دماغ میں میرے ارادے سے بے نیاز، باہزاراں شیوۂ دلبری بے محابا و بے حجاب آتی ہیں اور نوک قلم سے ٹپک پڑتی ہے! یہ باتیں نہ میری ہیں نہ ذاکر صاحب کے لیے ہیں۔ معلوم نہیں کس کی ہیں اور کس کے لیے ہیں لیکن ہیں سب کچھ!"

الہ آباد کا سفر تھا، ہندوستانی اکیڈمی یوپی سے ذاکر صاحب نے معاہدہ کر لیا تھا کہ معاشیات پر وہ ایک مقالہ پڑھیں گے۔ ذاکر صاحب دلّی سے روانہ ہوئے۔ میں علی گڑھ سے ساتھ ہو لیا۔ انٹر کلاس میں ذاکر صاحب ملے میں بھی جا بیٹھا، بڑی بھیڑ تھی۔

بولے۔ "رشید صاحب معاملہ دگرگوں معلوم ہوتا ہے۔ مقالہ لکھا نہیں ہے۔ خیال تھا رات بھر کا سفر ہے۔ ریل میں بیٹھ کر لکھ ڈالوں گا اب تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صبح تک زندہ ہی نہ رہیں گے۔ پھر کیا ہوگا؟"

میں نے کہا "مرشد فکر کی بات نہیں ہے چلیے سیکنڈ کلاس میں چلیں"۔ بولے "اور کرایہ؟" میں نے کہا "روپے تو میرے پاس بھی نہیں ہیں لیکن یہ علی گڑھ ہے آپ اترے تو روپے کا کوئی انتظام کر لیا جائے گا۔"

ہم دونوں اسباب اتروا کر سیکنڈ کلاس کی طرف چل نکلے پلیٹ فارم پر پہلے شناسا کو میں نے دونوں ٹکٹ دیئے اور یہ کہہ کر کہ اسے بدل کر سیکنڈ کلاس کے دو ٹکٹ لائیے اور روپے میرے گھر جا کر لے لیجیے گا۔ ہم دونوں سیکنڈ کلاس میں جا بیٹھے ٹکٹ مل گئے تو مرشد نے کہا "اس سے کیا ہوتا ہے کچھ زائد روپے بھی تو درکار ہوں گے سفر میں ٹکٹ کلکٹر ہی نہیں ہوتے خوانچے والے بھی ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "کھانا میرے ساتھ ہے" اکتا کر بولے، "وہ تو میں جانتا ہوں لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ خوانچہ والے کی بھی تو دلداری کرنی پڑے گی۔"

میں نے کہا "اس کی ذمہ داری بھی میں لیتا ہوں لیکن ایک شرط ہے۔"

بولے۔ "وہ کیا؟"

میں نے کہا "دہی بڑے نہیں خریدے جائیں گے۔ کابلی چنے والا پاس نہ آئے گا۔ کتاب اور اخبار والے کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھیے گا اور سب سے بڑی اور پہلی شرط تو یہ ہے کہ آپ کمپارٹمنٹ میں نہ چھوٹے بچوں سے یارانہ کریں گے اور نہ کسی احمق سے

اس طور پر گفتگو کریں گے عمر بھر وہ اپنے آپ کو افلاطون سمجھتا رہے۔"

بولے "سب منظور"۔

تھوڑی دیر بعد بولے۔ "رشید صاحب کھانا تو کھا ہی لیا جائے۔ ورنہ دھیان بٹا رہیگا ایسی حالت میں سنجیدگی اور خلوص سے گفتگو نہیں کی جا سکتی" کھانا نکالا گیا۔ اتنے میں ہاتھرس کا اسٹیشن آگیا۔ چا قو بیچنے والا گزرا تو بولے "ایک چا قو کیوں نہ خرید لیا جائے"۔

میں نے کہا "یہ کیوں"؟

بولے "ہاتھرس کے چا قو ہاتھرس سے باہر تو اکثر خریدنے کا اتفاق ہوا خود ہاتھرس میں خریدنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا"۔

میں نے کہا "یہ نہیں ہو سکتا"۔

کھانے سے فارغ ہو کر اطمینان سے بیٹھے تھے کہ ٹونڈلہ آگیا۔

میں اوپر کی برتھ پر بستر درست کر کے نیچے آیا۔ کیا دیکھا کہ مرشد دال موٹھ اور پیٹھے والے سے سودا چکا رہے ہیں۔

میں نے کہا "یہ کیا"۔

بولے "کچھ نہیں۔ معلومات میں اضافہ کر رہا ہوں۔ آپ بھی آجائیے"۔

یہ سماں دیکھ کر میرا دل بھی بیٹھنے لگا۔

مرشد بھانپ گئے۔ بولے "سفر طویل ہے۔ معلوم نہیں کیسے کیسے نامعقول لوگوں سے راستہ میں سابقہ رہے۔ ایسی حالت میں اعتماد و تقویت کا کچھ نہ کچھ سامان کر لینا چاہیئے میں کب کہتا ہوں ہر چیز کھا لینے ہی کے لیے خریدی جاتی ہے۔ لطف ہمرہی کے لیے بھی تو خریدی جا سکتی ہے"۔

دال موٹھ اور مٹھائی خرید لی گئی۔

پھر بولے "آئیے تھوڑا سا ان کو جھوٹا بھی کر دیں۔ ورنہ ارواح خبیثہ کا ان پر

سایہ ہو جائے گا۔" یہ مرحلہ بھی طے ہوا تو میں نے کہا "مرشد مزید خرافات ختم اب مقالہ لکھنا شروع کیجیے"۔ بولے "بیٹھیے بھی، آرام کی جگہ ملی ہے۔ خوب کھا پی لیا ہے۔ موسم کتنا معتدل اور سماں کتنا متوازن ہے۔"

میں نے کہا۔ "تو پھر"۔

بولے "جی میں آتا ہے کہ کنجشک بنوں!"[1]

اس پر ہم دونوں ہنس پڑے، دیر تک اس زمانہ کی یاد کرتے رہے۔ جب یہ اشعار خاص خاص موقعوں پر پڑھے جاتے تھے اور لطف اٹھایا جاتا تھا۔ بالآخر میں نے کہا "مرشد اب تفریح ہو چکی بس مقالہ لکھنا شروع کر دیجیے۔ اور میں جا کر سوتا ہوں۔"

مرشد نے کہا۔ "یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ سوئیں اور میں جان کھپاؤں اچھا میں لکھتا جاؤں اور آپ پڑھتے جائیں۔"

میں نے کہا۔ "اس سے کیا فائدہ؟"

بولے۔ "اس سے میرا لکھنے کا مومینٹم (MOMENTUM) قائم رہے گا۔ موقع موقع سے جہاں تہاں آپ اندو ہگینا[2] وغیرہ بڑھا دیجیے گا!"

اس پروگرام پر تھوڑی دیر تک عمل رہا پھر میں سو گیا۔ صبح اٹھا تو مرشد غالباً دس صفحے فل سکیپ کے لکھ چکے تھے۔ میں اُسے پڑھ گیا۔

کہنے لگے۔ "آج کے لیے کافی ہو گیا۔ کل کے اجلاس کے لیے پھر لکھ لوں گا۔"

---

[1] زمانہ طالب علمی میں علی گڑھ میں ذاکر صاحب نے ایک بار ہندوستان میں ایک کابلی کے (اللہ بہتر جانتا ہے!) تصنیف کردہ کچھ اشعار سنائے تھے جو بہت مقبول ہوئے اور زبان زد ہو گئے تھے وہ اشعار یہ ہیں ؎

خوشے انگور (انگور) کے سکے ہوں گے — پانی نہروں میں بھرے ہوں گے
جی میں آتا ہے کہ کنجشک بنوں — اڑ کے پھوں (پہنچوں) اپنی ولایت

[2] طالبعلمی ہی کے زمانے کی بات ہے میں ذاکر صاحب اور مولانا سہیل ساتھ تھے مولانا شاعری

(باقی حاشیہ صفحہ اگلے پر)

پھر بولے "آپ نے دیکھ لیا۔ کیسا پایا؟"

میں نے کہا۔ "مرشد کیا کہنے، کمال کیا ہے۔"

بولے۔ "نہیں سچ بتائیے۔ کیسا رہا۔ کبھی تو سنجیدہ ہو جایا کیجیے۔"

میں نے کہا "نہیں مرشد ایمان سے کہتا ہوں خوب لکھا ہے دوران مطالعہ میں

کرتے تھے اور میں گل منزل پر مضامین لکھتا تھا۔ ایک دن ذاکر صاحب نے کہا کہ وہ بھی کچھ لکھنا شروع کریں گے بشرطیکہ ان کو مضمون کے دو چار عنوان بتا دیئے جائیں۔ کئی دن تک عنوان کے چکر میں رہے۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں لائبریری سے افلاطون کی PLATO'S REPUBLIC (ریاست) لیے آ رہے ہیں۔ فرمایا عنوان نہ بتائیے۔ آپ لوگوں کی ضد میں ترجمہ کروں گا۔ چند ہی دنوں میں کافی ترجمہ کر ڈالا ترجمہ بے نظیر تھا اس کی ایک مختصر سی داستان ہے مولانا سہیل اس زمانہ میں کالج میں جو ذہانت، شاعری، تقریر، قابلیت میں سب سے اونچے سمجھے جاتے تھے ساتھ ہی ساتھ کالج میں فتنہ نمبر ابھی خیال کیے جاتے تھے اس زمانہ کا بڑے سے بڑا فرعون بھی خواہ وہ کسی فن کا فرعون، ہامان یا شداد نہ ہو تا مولینا کے سامنے کان پکڑ کر کہتا "یا استاد" ایک دن ذاکر صاحب نے مولینا کو یا مولینا نے ذاکر صاحب کو دھر لیا۔ ترجمہ سنانے کا اہتمام ہوا مولینا ایک کرسی پر پاؤں اٹھا کر اکڑوں بیٹھے اور اس پر بھی مطمئن نہ ہو کر اپنی کہنیوں کو رانوں کے درمیان کر کے ہتھیلی اور انگلیوں کو رخساروں سے یوں چپکا دیا جیسے کسی شیلف میں کتابیں جما دی گئی ہوں صرف ناک آنکھیں اور پیشانی گرفت سے آزاد تھیں، منہ میں پان بھرا ہوا تھا۔ اس دھج اور اہتمام سے مولینا صرف کسی بڑے ہی مسئلہ پر سوچنے کے لیے رونق افروز ہوا کرتے تھے۔

میں انگریزی پڑھتا جاتا ذاکر صاحب اس کا اردو ترجمہ سناتے جاتے۔ مولینا کے چہرہ پر شوخی پھیلتی نکھرتی جاتی تھی کچھ دیر بعد ذاکر صاحب اکتا گئے۔ اور بولے "پانی"

اکثر مقامات ایسے آئے جہاں میں نے بڑی حسرت سے یہ محسوس کیا کہ بس میرے میں ذرا سی عقل اور ہوتی تو میں یہ بھی سمجھ جاتا۔"

الہ آباد میں اس مقالہ کی دھوم مچ گئی۔ بڑے سے بڑا افلاطون جمع تھا ہر ایک یہ کہتا تھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو جیسا سُنا تھا اس سے بھی اونچا پایا۔

میں نے کتاب بند کر دی، مولینا کرسی پر سے اترے اور کمرے سے نکل کر باہر ہیک ڈالی، واپس آئے تو اعصاب کا سارا تناؤ ختم ہو چکا تھا ڈھیلے ڈھالے جھکے ہوئے لیکن ایک "لرزش خفی" کے ساتھ شاداں و فرحاں کمرہ میں داخل ہوئے اور فرمایا "ذاکر، شاد باش و شاد زی" ظالم غضب کرتا ہے افلاطون کو اردو آتی ہوتی تو وہ بھی یہی زبان اختیار کرتا۔ کمبخت بیماری نے کہیں کا نہیں رکھا، ورنہ میں بھی ایسا ہی ترجمہ کرتا۔" میں نے کہا "مولانا پھر تو افلاطون کا بھی بیچ نہ ہوتا۔" مولانا ہنسے اور جھولنے لگے۔ لیکن اس طور پر کہ افلاطون کی توہین کا مطلق خیال نہ تھا صرف اپنی دلدہی مقصود تھی۔

ذاکر صاحب نے میری طرف "رقیبانہ دیدہ، ہیچ نگفتہ" میں نے کہا "ہاں ذاکر صاحب" "گلاکن نے کہا" پھر"؟ ذاکر صاحب جھنجھلا سے گئے بولے "مولانا یہ سب تو ہوا لیکن یہ رشید صاحب اندوہ گینیاں، شہنائیاں وغیرہ کیسے لکھ ڈالتے ہیں، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا" مولانا میری طرف دیکھ کر ہنس پڑے بولے "خوب کہا یہ لکھنے والے کی نارسائی کی دلیل ہے" میں نے کہا "مولینا آپ ذاکر صاحب سے ڈر گئے ورنہ یقیناً صرف اتنا ہی کہتے "نارسائیاں ہیں" غرض بات آئی گئی ہوئی، لیکن یہ لفظ "اندوہگینیاں" اس دن سے چل پڑا اور جہاں کسی کی شاعری عشق یا طلبہ پر جلد سے جلد اور مختصر سے مختصر الفاظ میں تبصرہ کرنا ہوتا اس لفظ کو قول فیصل سمجھا جاتا۔ یعنی "کچھ دخل اندوہگینیاں رہے"۔

مُرشد

مارواڑی عورتوں، بنگالی مردوں اور شرعی مسلمانوں کے ساتھ سفر کرنے میں مجھے بڑی کوفت ہوتی ہے۔ ایک بار ان سب کا ساتھ ہوا۔ مرشد بالائے علم! حقیقت یہ ہے کہ مرشد نہ ہوتے تو زنجیر کھینچ لیتا یا سمت مخالف سے آنے والی گاڑی پر کود جاتا۔ ایک میں مالی نقصان تھا دوسری میں جان کا۔ کچھ ہوتا۔ یہ کیا کم تھا کہ اپنا ہی ہوتا قومی نقطۂ نظر سے یہ صورت مناسب نہ تھی پھر مرشد کا ساتھ، جن کی معیت میں ایک بار کانگریس کے پنڈال اور حکیم اجمل خاں مرحوم کے مطب میں ہو آیا تھا۔ بہر حال قوم کی خاطر میں نے زندہ رہنا اور سفر کرنا گوارا کر لیا۔

اسی طرح کی قومی الجھنوں اور ذاتی وسوسوں میں مبتلا تھا کہ مرشد پر نظر جا پڑی۔ معلوم ہوا کہ برہمی کے بجائے اضطراب کا عالم ہے۔ مرشد کا اضطراب دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو جب بھوکے ہوتے ہیں اور ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ بھوکے نہ ہوں، دوسرا ایک واقعہ ہے جس سے شاید کم لوگ واقف ہوں۔

جس سال کالج نان کوآپریشن کی زد میں آیا مرشد اور میں ہم نوالہ ہم اقامہ ہم سبق اور ہم خیال تھے۔ مرشد ان طلبہ میں سے تھے جن سے کالج کے اربابِ حل و عقد مرعوب یا مشتبہ رہے۔ وہ یوں کہ ان کی حاضری ہمیشہ کم رہتی تھی لیکن اچھے سے اچھے نمبروں سے پاس ہوتے۔ یونین کے بے مثل مقرروں میں سے تھے کرتا، پاجامہ گھریلو، ڈاڑھی شرعی، شیروانی حیدر آبادی، غذا ڈائننگ ہال کی

ناشتہ دوسروں کا، دوا دہلی کی۔ مرشد کو ہمیشہ اس کا اندیشہ رہا کہ ان کی تندرستی ناقابلِ اعتبار ہے اس لیے آس پاس کے تمام معتبر اور غیر معتبر حکیم اور ڈاکٹروں سے رجوع کیا کرتے تھے جن میں حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری بھی تھے اور ایسے بھی جن کے نام سے یا تو ان کا سائن بورڈ واقف ہوتا یا خود مرشد یا پھر وہ جن کے بارے میں کہا گیا ہے۔

آں را کہ خبر شد خبرش باز نہ آید

دہلی جا کر ان سب کی تجویز کردہ یونانی انگریزی ویدک دوائیں خریدتے، طرح طرح کے پھل اور مٹھائیاں بھی ہوتیں۔ اسٹیشن کے خوانچہ فروشوں سے بھی کچھ نہ کچھ خرید لاتے۔ بورڈ تک پہنچ کر اعلان کرتے، مریضوں اور مخلصوں کا اجتماع ہوتا۔ ان فتوحات میں شریک ہونے کی ایک شرط تھی یعنی جو شخص پھل یا مٹھائی میں حصہ لگائے اس کو دوا بھی کھانی پڑے گی۔ اور جو شخص اپنی پسند کی دوا کھائے گا اس کو مرشد کا انتخاب کیا ہوا پھل کھانا پڑے گا اسی طرح اس کے برعکس مرشد دواؤں کے خواص اس مخلصانہ انداز سے بیان کرتے کہ ہم سب اپنے میں کوئی نہ کوئی بیماری یا اس کے آثار محسوس کرنے لگتے۔ کسی نے دوا کھانے میں تامل کیا تو اس کو امراض کے عواقب سے اس طور پر ڈراتے جس طرح مولوی عذابِ عقبیٰ سے۔ اپنی لائی ہوئی دوائیں مرشد خود بہت کم استعمال کرتے البتہ جہاں کہیں پہنچ جاتے اور کسی اور کی دوا رکھی ہوئی ملجاتی تو اس کو کھائے بغیر نہ رہتے تھے۔ کسی مریض یا مرض کے لیے دوا تیار ہونے کا اہتمام یا چندہ ہوتا تو مرشد خود شریک ہوتے۔ قدمے دامے سخنے۔

ایک دفعہ عطاء اللہ خاں درانی کے کمرے میں پہنچ گئے، خان کو کیمیا بنانے اور کھچڑی پکانے سے غیر معمولی شوق تھا۔ صبح سے شام تک سید محمود (کچی بارک)

کے برآمدے میں انگیٹھی دہکتی رہی۔ کیمیا سے سیر ہو جاتے تو کھچڑی کی دیگچی آگ پر رکھ دیتے اور کھچڑی سے فراغت پاتے تو کیمیا میں مصروف ہو جاتے۔ نمونیا سے ڈرتے تھے اور کسی لڑکی پر عاشق تھے مرشد نے فرمایا بھوکا ہوں کچھ کھلاؤ۔ خان نے کہا کھچڑی میں تو دیر ہے اور اس وقت کچھ اور موجود نہیں۔ بریکٹ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا اس مرتبان میں کیا ہے فرمایا معجونِ جالینوس دہلی سے منگایا ہے۔ اتنے میں خان کسی دوسری طرف متوجہ ہوئے، مرشد نے ساری معجون مرتبان سے معدہ میں منتقل کر دی۔

مرشد پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ کہنے لگے ہندوستانی دواؤں میں شکر خوشبو یا بدبو کے علاوہ کوئی اور بات قابلِ اعتنا نہیں ہوتی۔ اس لیے مقدار کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ پھر بات دیسی طریقۂ علاج پر چلی۔ فرمایا اطبا مرض کا علاج کرتے ہیں، ہونا چاہیے مریض کا علاج۔ مرض ایک غیر شخصی چیز ہے۔ مریض ایک شخصیت عام طور پر اطبا دونوں کو ایک قرار دیتے ہیں اسی سبب سے کبھی کبھی مرض جاتا رہتا ہے تب بھی مریض ماؤف رہتا ہے۔ عرض کیا مرشد، آپ کی قسمت میں دوا کھانے کے بجائے دوا تجویز کرنا ہو تو کیا کرتے؟ فرمایا ہر مرض کا علاج اچھی سے اچھی غذا سے کرتا۔ میں نے کہا علاج الغربا شاید اسی اصول پر تصنیف کی گئی ہے۔

ذکر تھا کالج پر نان کوآپریشن کے حملے کا اور بیچ میں آ گئے "یہ صفحاتِ معترضہ" مرشد کو نان کوآپریشن کی تحریک سے کوئی ایسی دلچسپی نہ تھی بلکہ اربابِ کالج کے ایک حد تک معاون تھے اور نان کوآپریشن کی تحریک کے جلسوں اور ہنگاموں میں تفریحاً شریک ہوا کرتے تھے۔ وہ رات آج بھی یاد ہے جب ہم دونوں شورش مچانے والوں کی "سعیِ لاحاصل" پر صاحب باغ میں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے

کہ صبح کالج تو جانا نہیں ہے۔ ناشتے میں دلیا کی بجائے کھچڑی کیوں نہ ہو۔ اتنے میں سید نصیر الدین علوی گاتے، گالی دیتے اور ہکلاتے آگئے۔ ان سب سے فارغ ہو کر گویا ہوئے۔ "صبح مجھے غسل کرکے مولانا محمد علی کی ہونے والی تقریر کا جواب سوچنا ہے۔" ذاکر صاحب نے کہا یہی مجھے بھی کرنا ہے۔ بحث کی نوعیت یہ تھی: ذاکر صاحب کہتے تھے دو باتوں میں سے ایک کرنی ہوگی۔ یا تو میں نہاؤں گا آپ تقریر کا جواب سوچیں گے یا آپ غسل فرمائیں گے میں تقریر کا جواب سوچوں گا دونوں حرکتیں دونوں نہیں کریں گے۔ علوی صاحب کو اس پر اصرار تھا کہ پہلے یہ طے کر لیا جائے کہ غسل کا حق مرجح کس کو ہے۔ اس پر تا دیر دونوں میں طرح طرح کی بحث طرح طرح سے ہوتی رہی۔

صبح ہوئی، یونین میں جلسہ ہوا۔ میں اور مرشد بھی ایک طرف بیٹھ رہے۔ مولانا محمد علی نے حسب معمول بڑی پر زور تقریر کی لیکن حاضرین پر کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ ان کے بعد مولانا شوکت علی آئے۔ دوپہر ہونے والی تھی دونوں بھائی ٹرین سے کہیں باہر جانے والے تھے۔ تقریروں کی آخری اور کمزور موجیں کنارِ ساحل سے ہم آغوش ہونے والی ہی تھیں کہ مولانا شوکت علی نے آخری بار ایک مایوسانہ وارفتگی کے ساتھ یہ مشہور اور فرسودہ شعر

سپردم بہ تو مایۂ خویش را تو دانی حسابِ کم و بیش را

پڑھا اور کھلے ہوئے انداز سے جا کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ مڑ کر دیکھتا ہوں تو مرشد کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ دم بہ خود ہو گیا۔ مجمع قابو سے باہر ہو گیا تھا، مرشد کو کھینچتا ہوا باہر لایا۔

پوچھا یہ کیا ہوا۔ فرمایا "رشید صاحب، الوداع، زندگی کا آغاز بخیر ہوا، انجام کے بھی بخیر ہونے کی دعا کیجئے گا میرے پاس جو کچھ میرا ہے وہ یوسف

اور محمود (دو چھوٹے بھائی) کے حوالے کر دیجیے گا، کالج کے کاغذات ہوں گے ان کو واپس بھیج دیجیے گا۔ میں نے کہا مرشد، اس تحریک سے متعلق اکثر گفتگو رہی، آپ اس طریقۂ کار کے کچھ ایسے موئد بھی نہ تھے۔ آخر یہ ہوا کیا؟ فرمایا تحریک غلط ہو یا صحیح، اس کے بارے میں یقین اور صحت کے ساتھ کچھ کہنا ناممکن بھی ہے اور قبل از وقت بھی۔ مجھے جس بات نے بے دست و پا کر دیا وہ یہ خیال تھا کہ کہنے والے یہ نہ کہیں کہ علی گڑھ نے ایسی ایک تحریک میں حصہ نہ لیا جس میں مصائب کا سامنا تھا۔ مجھے تو یہ بتلانا ہے کہ فرزندانِ علی گڑھ رزم اور بزم دونوں کی ذمہ داری اٹھا سکتے ہیں۔ آپ مزاحم نہ ہوں۔ پانسا پھینکا جا چکا ہے، انجام جو کچھ ہو اچھا خدا حافظ۔

ریل پر سفر کرنے والوں کی ایک عجیب ذہنیت ہوتی ہے۔ ٹکٹ خرید لینے کے بعد اور کبھی اس کے بغیر بھی یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ ہر ایسے فعل کے لیے آزاد ہیں جس سے کمپارٹمنٹ میں گندگی پھیلتی ہو یا مار پیٹ ہو جانے کا امکان ہو۔ ڈبے میں داخل ہوں گے یا داخل ہونے دیے جائیں گے تو اس بدگمانی کے ساتھ کہ دوسرے تمام مسافروں نے ان کے آسایش کے حقوق غصب کر لیے ہیں۔ اور یہ نان کوآپریٹر قسم کے مظلوم ہیں، ان کو حق پہنچتا ہے کہ جتنا ظلم چاہے کر لیں، دوسرے کو شکایت یا تدارک کا حق نہیں۔ دوسری طرف بقیہ مسافر اس پر تلے ہوتے ہیں کہ نان کوآپریشن کا چاہے جو انجام ہو، نو وارد کی جان ورنہ ناموس کی خیر نہیں۔ دونوں اپنی جیسی کر ڈالتے ہیں لیکن جلد ہی اس طرح گھل مل جاتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ بک بک کرنے، دہی بڑے کھانے اور جھوٹے پتے ادھر ادھر بکھیرنے لگیں گے۔

عام طور پر دیکھنے میں یہ آیا ہے بچے، عورتیں، ریل کے مسافر، محنتی مزدور وغیرہ معمولی سی معمولی بات پر برہم ہو کر اس شدت سے لڑتے جھگڑتے ہیں جیسے

اس کے بعد پھر کبھی ایک دوسرے کا منہ دیکھنا گوارا نہ کریں گے۔ اور نا معلوم مدّت تک درپئے انتقام رہیں گے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں فریقین ایک دوسرے سے بے تکلف ہو جائیں گے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا حالانکہ اس سے بدرجہا کم بے تکلفی کا کوئی واقعہ پڑھے لکھے مہذّب لوگوں کو پیش آجائے تو عمر بھر کے لیے ایک دوسرے سے منحرف ہو جائیں گے۔ شاید ایک کا تعلق جبلّت حیوانی سے دوسرے کا تہذیب انسانی سے ہے۔

کمپارٹمنٹ اور غسل خانے کی سرحد پر بیٹھے ہوئے ایک شرعی مسلمان "وضو بنا رہے تھے"، وضو کا لوٹا بالعموم میلا اور ٹپکتا ہوتا ہے میلا ہونا اور نہ ہونا ایک نکتہ سے بھی تعلق رکھتا ہے یعنی جب تک کوئی چیز ظاہر ہے اس کے میلے ہونے نہ ہونے کا سوال غیر متعلق ہے۔ اگر کسی کو اس سے اتفاق نہیں ہے تو اس کو اپنے گریبان یا تہبند میں منہ ڈال کر غور کرنا چاہیے۔ تہبند شرع کی رو سے یقیناً پاک ہوگا لیکن حفظانِ صحت کے اصول سے میلا اور متعفّن۔

چنانچہ وضو اس طور پر کیا جا رہا ہے کہ کچھ پانی کمپارٹمنٹ کے فرش پر گر رہا ہے اور کچھ غسلخانے میں۔ اور دونوں کا آمیزہ لباس اور جسم پر وضو "بن گیا"، تو اس فاتحانہ انداز سے کھڑے ہوئے جیسے کوئی پرانے زمانے کا تھانیدار دفعہ ۱۴۴ کے ملزم کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوا ہو۔ بھیگے ہوئے اعضا کو کپڑے سے خشک کرنے کی بجائے ہاتھوں سے پونچھ کر چھینٹے ہوا میں اُڑا رہے ہیں۔ کوئی برا مانے یا معترض ہو تو اس طور پر بپھریں گے جیسے اسلام خطرے میں ہو اور صرف یہی ایک مسلمان، دجّال سے نپٹنے کے لیے بقیدِ حیات ہوں۔ گاڑی کانپور پہنچی، نماز کا وقت تھا گاڑی سے اتر پڑے اور پلیٹ فارم پر نماز پڑھنا شروع کر دیا۔ ان کو دیکھ کر کچھ اور مجاہد چھینٹے اور نماز باجماعت شروع ہو گئی۔ کوئی لیڈر نان

کو آپریشن وغیرہ کے سلسلے میں گرفتار کیے گئے تھے۔ اور اسی ٹرین سے کہیں بھیجے جا رہے تھے۔ پلیٹ فارم پر ایسا ہجوم اور شور و غوغا تھا کہ کسی کو اپنی عزت و عافیت خطرے سے خالی نظر نہیں آتی تھی۔

سمجھ میں نہیں آتا اس وقت نمازِ باجماعت ادا نہ کرنے سے اسلام کو کوئی خطرہ لاحق تھا۔ میدانِ جنگ میں بھی نمازِ باجماعت ہوئی ہے اور ہونی چاہیے لیکن یہ کیسے مان لیں کہ اس وقت پلیٹ فارم پر باجماعت نماز ادا کرنا ضروری تھا اور اس طرح کی نماز ایسے مقام پر کیوں ضروری تھی جہاں ہر طرح کے لوگوں کا ہجوم ہو، ہلچل مچی ہو۔ اور عامۃ الناس کو جن میں مسلمان بھی شامل ہیں راحت اور آزادی کے ساتھ ضروری کاموں کے انجام دینے میں دشواری پیدا ہوتی ہو اگر اس ہلڑ اور دوڑ دھوپ میں باجماعت نماز ادا کی جا سکتی ہے تو مسجد کے سامنے باجا بجنے اور جلوس کے گزرنے پر مسلمان نماز ادا کرنے سے کیوں قاصر رہتے ہیں!

اسی پیچ و تاب میں تھا اور ہر اناڑی ریفارمر ابتدا میں اس طرح کی منہ زوری سے کام لیتا اور بے ضرورت آمادۂ شہادت رہتا ہے کہ مرشد سے داد لینے کے لیے متوجہ ہوا "خدّام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے"، آواز دی مرشد آگیا عین پلیٹ فارم پر وقت نماز، دیکھیے ایک ہی صف میں محمود و ایاز کھڑے ہیں۔ یہ وقت سونے کا ہے یا گورنمنٹ کو گالی دینے کا۔ مرشد نے آنکھیں کھول دیں سامنے سے ایک خوانچہ والا گزر رہا تھا اس سے دہی بڑے کی خیریت پوچھی کون سا اسٹیشن ہے بڑی چہل پہل ہے کوئی بڑا اسٹیشن ہوگا۔ اس نے کہا۔ کانپور ہے۔ فرمایا یہیں وہ کانپور والی مسجد ہے میں نے پوچھا یہ خطرہ آپ کو کیسے گزرا فرمایا کچھ نہیں پلیٹ فارم کے نمازیوں کو دیکھ کر خیال آیا۔ میں نے کہا مرشد کھانے اور سونے دونوں سے نفرت۔ ذرا یہ تو بتائیے اس وقت

پلیٹ فارم پر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

کہنے لگے نمازی اور آپ دونوں نیک لوگ ہیں نمازیوں کا تو یہ خیال ہے کہ جب تک نماز پڑھتے جائیں عقل کو کام میں لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو یہ مغالطہ کہ جب تک عقل ہے نماز پڑھنا چہ ضرور۔ آخر اس شخص کے پیچھے ڈنڈا لیے کیوں پھریں جو ہمارے آپ کے خیالات سے متفق نہ ہوں۔ ہر شخص جداگانہ طبیعت، جداگانہ مذاق اور جداگانہ مقاصد رکھتا ہے۔ آپ کا شمار نہ تو ائمہ معصومین میں سے ہے اور نہ حکومتِ برطانیہ سے کہ غلطی کا ارتکاب ممکن نہیں۔ بھلا مانس وہ ہے جو حتی الوسع لوگوں سے ہم آہنگ رہ سکے، زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے بہرہ مند ہوں اور کم سے کم لوگوں سے وہ خود نفع اٹھائے ہو مسلمان ہونے کا مفہوم یہ بھی ہے۔ میں نے کہا یہ باتیں تو غیر متعلق ہیں مجھے تو یہ بتائیے کہ اس وقت اس پلیٹ فارم پر نمازِ با جماعت کی کیا ضرورت تھی۔ آپ نے ایسے بزرگوں کو بھی دیکھا ہوگا جو اس تیور اور تجر کے ساتھ آمادۂ نماز ہوتے ہیں۔ جیسے وہ سارے مسلمان جو ان کے پیچھے نماز نہ پڑھیں گے دوزخی ہیں۔

خبط اور خطابت کا جو دورہ مجھ پر پڑا تھا اس کو جاری رکھتے ہوئے عرض کیا کہ مرشد، یہ کچھ نماز ہی پر موقوف نہیں ہے۔ بعض اصحاب روزہ بھی اسی ذہنیت کے ساتھ رکھتے ہیں، ان کے روزہ رکھنے کے یہ معنی ہیں کہ وہ کسی شریف آدمی سے ملنے کے لائق نہیں رہ جاتے۔ اور دوسرا شریف آدمی ان سے ملنا گوارا نہ کرے گا مثلاً آپ شکایت کریں کہ ملنے گیا معلوم ہوا آپ آرام فرما رہے ہیں فرمائیں گے کیا کروں روزہ ہے آپ کہیں گے فلاں کام کا وعدہ کیا تھا اب تک پورا نہیں کیا۔ فرمائیں گے روزہ ہے۔ آپ نے خط کیوں نہیں بنوایا جواب ملے گا روزہ ہے اور کپڑے کیوں میلے ہیں، روزہ ہے ہنستے کیوں نہیں روزہ

ہے، انتقال فرمانے میں کیا قباحت ہے، تم جہنمی ہو!

مرشد نے فرمایا روزے کا ذکر ہوتا رہے گا کچھ اس کا بھی خیال ہے کہ اس کے ذکر و شغل سے معدے پر کیا اثر پڑتا ہے۔ کھانے پینے کا کچھ بندوبست کیجیے اس کے بعد روزے پر زیادہ یکسوئی اور آسودگی سے گفتگو کی جائے گی۔ کھانا نکالا گیا مرشد نے پہلا لقمہ فرو کیا اور پانی کا ایک پورا گلاس اس کے تعاقب میں روانہ کیا پھر فرمایا آج کل فرائض مذہبیہ کا ادا کرنا لوگوں نے خدا پر احسان کرنے اور اس کے بندوں سے ناواجب نفع کمانے کا وسیلہ سمجھ لیا ہے۔ مثلاً روزے اس لیے نہیں رکھتے کہ شعائرِ اسلام میں سے ہے اور اس قسم کی پابندی نفس کو بے راہ روی سے روکتی ہے اور اس کا اثر انفرادی اور اجتماعی زندگیوں پر اچھا پڑتا ہے بلکہ اس طرح نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے سے خدا کے وہ تمام اختیارات ان کے ہاتھ میں آجاتے ہیں جن سے وہ اپنے بندوں کو جلاتا، مارتا یا عزت اور ذلت دیتا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ خدا کی بخشنے کی طاقت اپنے لیے اور چھیننے کی دوسروں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے عبادت کو گناہ سے بچنے کا نہیں بلکہ گناہ کی باز پرس سے بچنے کا وسیلہ سمجھ رکھا ہے۔ مثلاً پانچ گناہ کیے پانچ وقت کی نماز پڑھ دی حساب کتاب برابر ہو گیا۔

عرض کیا کیوں مرشد سوراج مل گیا تو آپ ریل میں سفر کرنے والوں کی بدعنوانیوں کا کیا علاج کریں گے فرمایا سوراج کی کچھ آپ کی مسلم یونیورسٹی تو نہیں کہ قوم کی ساری ضرورتوں کا کفیل ہونے کا دعویٰ کرے۔ میں نے عرض کیا کہ سوراج ملنے پر ہندوستانیوں کو سیکنڈ کلاس میں سفر کرنا یا وہاں کے غسلخانے کے آداب برتنے نہ آئے تو حیف ہے آپ پر اور

آپ کے سوراج پر فرمایا ہندوستانیوں کو سیکنڈ کلاس نہیں بلکہ تھرڈ کلاس میں ٹھکانے سے سفر کرنا یا وہاں کے غسل خانوں کے طور طریقے ملحوظ رکھنا آجائیں تو سوراج کی ضرورت باقی نہ رہے۔ آخر میں یہ عرض کیا مرشد بات دراصل یہ ہے کہ ان انگریزوں کی وجہ سے ہم ہندوستانیوں کے لیے قضائے حاجت کا مسئلہ اختیاری نہیں بلکہ اضطراری بن گیا ہے۔ کلکٹر صاحب کا سامنا ہوتے ہی ہم پر پہلا جو ردِ عمل ہوتا ہے وہ ہم کو غسل خانے کے آداب ہی نہیں غسل خانے کے موقع اور مصرف ہی سے یکسر بے نیاز کر دیتا ہے۔

پورب سے کاجل کا سا بادل اٹھتا گھٹتا جھومتا پھنکارتا بل کھاتا ہوا جیسے "فیلِ مست بے زنجیر" یا جیسے انگریزوں کا کوئی ڈریڈ ناٹ کہیں پیغام صلح لے جا رہا ہے۔ شام ہونے لگی تھی پانی برسنے لگا میں نے کہا مرشد ہندوستان کی برسات سے بھی زیادہ پر کیف منظر کہیں دیکھا ہے کیسی گھٹا اٹھی ہے کس چم خم سے بجلی چمکتی ہے، کیسی جانفزا ہوا ہے کتنی اچھی بارش ہو رہی ہے۔ آپ تو بڑے جہانبانِ جہاں گشت ہیں۔ کچھ سنائیے فرمایا:

بن بادل بجلی کہاں چمکی .....

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال

غالبؔ

اقبالؔ کو معلوم نہیں کس عالم میں آبِ رودِ گنگا گلستانِ اندلس کی یاد آئی۔ اِس وقت ذاکر صاحب کے تصوّر کے ساتھ مجھے علی گڑھ یاد آرہا ہے اور کیوں نہ آئے جب بلا کشانِ علی گڑھ کے لیے آبِ رودِ گنگا اور گلستانِ اندلس دونوں کا قرآن السّعدین علی گڑھ ہو۔

گلستان اور رود بار دونوں کی زندگی و زیبائی کا مدار ایک دوسرے پر ہے۔ زندگی آزادی اور روانی ہے اسی آزادی اور روانی سے "زندہ ہیں اقوام" اور انھی اقوام کے جلیل و جمیل کارنامے گلستانِ اندلس ہیں، جن کو وہ آبِ رودِ گنگا (زندہ رود) کے کنارے اور سہارے تعمیر کرتی چلی جاتی ہیں۔ آبِ رودِ گنگا ایک صلائے عزم و عزیمت ہے، ازلی و ابدی، صحت مند حوصلہ مندی اور صالح مہم جوئی کی۔ جو ملّتیں اس رمز کو نہیں سمجھتیں یا اس آزمایش میں پڑنے سے گریز کرتی ہیں، وہ اپنی تقدیر کو صرف جھیلتی ہیں، اس کو بدل نہیں سکتیں۔

۱۹۱۵ء میں ام اے او کالج میں داخلہ لیا اور ذاکر صاحب سے پہلے پہل ملاقات ہوئی۔ موصوف دو ایک سال پہلے سے یہاں طالب علم تھے چونپور سے آیا تھا، جو کبھی علم و فضل اور شرافت و شائستگی کا گہوارہ رہ چکا تھا۔ ذوق اور ذہن پر اس کا برائے نام تصرّف بھی تھا۔ علی گڑھ نے اس تصرّف کو

تازہ اور توانا کر دیا اور ایسا محسوس ہوا، جیسے امید و آرزو کا ایک وسیع روشن افق سامنے آگیا ہو اور نئی راہیں اور وادیاں، نئے سفر، نئے برگ و سامان، اور نئی تقدیر کی دعوت اور بشارت دے رہی ہوں۔ جن سے ملا، جن کو دیکھا یا اس ارادے کی جن گرانمایہ اور دل آویز شخصیتوں کے بارے میں سنا، اس سے اس آبِ رودِ گنگا اور گلستانِ اندلس کا نقشہ سامنے آیا، جن کی چالیس سال پہلے علی گڑھ میں داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ اس نقشے نے اپنے سے پہلے کی گنگا اور اندلس کی نشاندہی کی۔ یہاں تک کہ تصوّر و تاریخ کے بے شمار اوراقِ تصور دیکھتا ہوا، اس دیارِ شرف و سعادت تک پہنچ گیا، جہاں سے عظمتِ انسان اور انسانیت کے ہر رودِ گنگا اور گلستانِ اندلس کی آبیاری ہوتی ہے۔

کچھ عرصہ پہلے ذاکر صاحب کے دو بڑے بھائی مظفر حسین خاں اور عابد حسین خاں مرحومین یہاں کے طالب علم رہ چکے تھے۔ ان میں سے کسی کو میں نے نہیں دیکھا، لیکن ان کی شرافت اور ذہانت کا چرچا ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر تھا۔ اس کی تصدیق ذاکر صاحب کی پاکیزہ سیرت، غیر معمولی قابلیت اور دل کش شخصیت سے اس طرح ہوتی تھی، جیسے ان بھائیوں میں سے کسی سے براہِ راست متعارف ہونے کی ضرورت نہ رہ جاتی ہو۔ جن لوگوں نے عابد حسین خاں مرحوم کو دیکھا تھا ان کا بیان ہے کہ ذہانت و فطانت میں وہ تمام بھائیوں میں فرد تھے۔ مظفر حسین خاں مرحوم کے بارے میں مشہور تھا کہ بڑے سنجیدہ، ذی علم، صلح جو، کم سخن اور عزلت پسند تھے، ان کا ایک انگریزی مضمون اس وقت کے ایک بڑے ممتاز انگریزی رسالہ "ماڈرن ریویو" میں پڑھا تھا، جس کے ساتھ ان کی تصویر بھی چھپی تھی۔ مضمون ایسی سہل اور شستہ زبان میں لکھا گیا تھا کہ اس کے سمجھنے میں نہ صرف یہ کہ کوئی دقت

نہیں ہوئی، بلکہ ایسا محسوس ہوا جیسے سہل اردو اور یہ انگریزی ایک ہوں۔ چوتھے بھائی زاہد حسین خان تھے، جو میرے سامنے فرسٹ ایر میں داخل ہوئے کتنا قد آور، تناسب الاعضا، سرخ سپید، خوش رو، شرمیلا، پاکباز نوجوان مشکل سے سولہ سترہ کا سن۔ اقبال نے ایسے ہی نوجوان کو قبیلے کی آنکھ کا تارا کہا ہوگا ان کو دیکھ کر کچھ اس طرح کا احساس ہوتا ہے جیسے یہ قائم گنج سے نہ آئے ہوں بلکہ جنت سے براہِ راست علی گڑھ میں اتار دیے گئے ہوں ایک دن معلوم ہوا کہ وہیں پہنچ گئے جہاں سے ان کے اتارے جانے کا خیال دل میں پیدا ہوا کرتا تھا۔ خاندانی نامراد مرضِ دق کا تینوں بھائی شکار ہوئے۔ دوسرے بھائی یوسف حسین خاں اور محمود حسین خاں ہیں۔

پچھلے سال یوسف صاحب مسلم یونیورسٹی کی پرووائس چانسلر شپ سے سبکدوش ہو کر رخصت ہو رہے تھے سارا اسباب بھیجا جا چکا تھا جانے میں دو تین دن رہ گئے تھے۔ ایک آدھ میز دو چار کرسیاں اِدھر اُدھر پڑی تھیں۔ بیگم یوسف کی طویل علالت اندیشہ ناک حد تک پہنچ چکی تھی۔ یونیورسٹی کی فضا ویران اور سنسان، جیسے معلوم نہیں کب، کس کو، کیا سانحہ پیش آجائے جنگ کی ہولناکیوں سے ملک، دوچار۔ حسبِ معمول ملنے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک ضخیم کتاب کے مطالعہ میں منہمک ہیں، قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں، اک "جذبۂ بے اختیارِ شوق" سے فرمایا: آپ نے سرسید کی تفسیرِ کلام پاک پڑھی ہے؟ کل ہی لائبریری سے لایا۔ کبھی پہلے نظر سے گزری تھی، اب جو دیکھتا ہوں تو عجب اک جہانِ معنی ہے۔ میں نے دبی زبان سے عرض کیا: سرسید کی تفسیر تو نہیں، ان دنوں ان کی "اسباب بغاوتِ ہند" کے ہجے کیا کرتا ہوں جس تشویشناک حالات کے نرغے میں یوسف صاحب اس وقت تھے، اس میں

ان کے مطالعے کا یہ انہماک دیکھ کر حیران رہ گیا۔ تاریخ، تنقید، فلسفہ، مذہب، ادب بالخصوص فرانسیسی ادب کا اتنا جامع اور مستند مطالعہ آس پاس کے لوگوں میں سے کسی اور کے حصے میں شاید ہی آیا ہو۔ یونیورسٹی کے ہمہ وقت انتظامی امور کے فشار میں مبتلا، غیر معمولی ناسازگار حالات میں گرفتار، لیکن علم و ادب سے یہ شغف، یوسف صاحب کی سیرت کے بعض بڑے صالح دل کش پہلوؤں کو نمایاں کرتا ہے، جیسے اعلیٰ اقدار کی پیروی سے انہوں نے اپنے آپ کو زندگی اور زمانے کے مکائد و مصائب سے بے نیاز کر لیا ہو۔

اس وقت ۱۹۴۷ء کا بہیمانہ دورِ خون آشامی و غارتگری یاد آتا ہے۔ مسلسل تردّد، تشویش اور جانکاہی کے سبب ذاکر صاحب کی صحت تیزی سے گرنے لگی تھی۔ احباب اور ڈاکٹروں کے اصرار سے مجبور ہو کر بحالیِ صحت کی خاطر کشمیر کے لیے روانہ ہوئے۔ جالندھر پر ٹرین روک لی گئی جہاں خونریزی کا جنون انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ ذاکر صاحب کو گاڑی سے اتار کر قتل گاہ کی طرف لے چلے۔ اللہ کی رحمت سے جس کا گوارا نام ہم نے نخت و اتفاق رکھا ہے، ریلوے کا ایک اہلکار ذاکر صاحب کو پہچان لیتا ہے اور انہیں اسٹیشن ماسٹر کے دفتر میں بٹھا کر ایک سکھ فوجی افسر کو بلاتا ہے۔ یہ افسر عین اس وقت جب تلواریں چھرے اور غضبناک نعرے فضا میں بلند ہو رہے تھے، ذاکر صاحب کو اپنی حفاظت میں لے لیتا ہے۔ یہ دونوں ہمیشہ ہماری احسان مندی اور شکر گزاری کے سائے میں رہیں گے۔

یہ حادثہ دیکھا نہیں، لیکن اس کا تصوّر کر سکتا ہوں۔ ذاکر صاحب سوئے مقتل اسی دلجمعی سے جا رہے ہوں گے، جیسے جمہوریۂ ہند کے معزز صدر کی حیثیت سے کسی علمی، ثقافتی یا اس طرح کی کسی اور تقریب کا افتتاح کرنے، یا پھر کسی

شادی خانہ آبادی میں بانیانِ تقریب، دولھا دلہن کے ساتھ تصویر کھنچوانے، ان کو ہاتھوں ہاتھ اور زیادہ ہوا تو کشاں کشاں لیے جا رہے ہوں۔ بہرحال بخیریت تمام دہلی مکان پر واپس آئے، تو بشرے سے ایسا ظاہر ہوتا تھا جیسے کوئی میلاد خواں مہنگے سمے توقع سے زیادہ نقدی اور مٹھائی پاکر بیوی بچوں میں پہنچ گیا ہو۔

ذاکر صاحب کے اس اطمینان و استقامت کے ذکر کے ساتھ ایک اور حادثہ یاد آتا ہے، جو آنکھوں کے سامنے گزرا۔ جب وہ یہاں وائس چانسلر کی حیثیت سے تشریف لائے، ان پر قلب کا دورہ پڑا اور وہ سب گزر گیا جو ایسے میں گزرا کرتا ہے۔ اس کا ذکر نہ کرتا، اگر کچھ دنوں بعد خود اس حادثے سے دوچار نہ ہوا ہوتا اور یہ نہ معلوم ہوتا کہ اس کے شدائد کیا ہوتے ہیں، اور ایسے میں نفس کی کمزوری یا روح کی برتری کب، کہاں اور کس طرح اپنا رنگ دکھاتی ہے ہم دونوں شام کو تھوڑی دور ٹہل کر واپس آتے تھے۔ ذاکر صاحب مہمان کے کمرے میں ٹھہر گئے، میں اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس گیا۔ تو کوئی غیر معمولی بات نہ دیکھی سوا اس کے کہ موصوف شیروانی سمیت چارپائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ دن میں وہ شیروانی شاید ہی اتارتے ہوں۔ آرام کرنا ہوا، تو چکن سمیت لیٹ رہیں گے۔ اور باندک اشارہ یا اطلاع اس طرح اٹھ کھڑے ہوں گے، جیسے امرجنسی وارڈ کے ڈاکٹروں کے آرام کرنے اور اٹھ کھڑے ہونے کا طریقہ ہے۔ چاہا کہ اِدھر اُدھر کی کوئی بات چھیڑوں۔ ذاکر صاحب نے بڑے ہموار اور استوار لہجے میں فرمایا "قلب کا دورہ پڑ رہا ہے" ایسا محسوس ہوا کہ، جیسے آخری وقت ہے چاہا کہ آپ کو آواز دوں۔ پھر خیال آیا کہ جلدی کیا ہے، جو ہونے والا ہے، وہ ہو کر رہے گا۔ آپ بھی آتے ہی ہونگے"

ذاکر صاحب کے اس اطمینانِ قلب پر دم بخود رہ گیا۔ موصوف نے بالکل نہیں کہا کہ ڈاکٹر بلایا جائے، گھر پر اطلاع کی جائے یا وہاں پہنچا دیا جائے۔ ڈاکٹر بلائے گئے، گھر پر اطلاع کی گئی، موٹر آئی، اور بڑے اطمینان سے اس میں بیٹھ کر کوٹھی پر آگئے، جیسے کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ بعد میں ڈاکٹروں نے بتایا کہ ذاکر صاحب پر وہ سب حادثے گزر گئے، سوا زندگی کے آخری حادثے کے۔ میرا ہر وقت کا آنا جانا رہتا تھا۔ ذاکر صاحب پر چاہے جو گزرتی ہو، لیکن بات چیت یا چہرے بشرے سے کبھی یہ محسوس نہ ہوا کہ وہ ہر لمحہ کتنے سنگین امکانات کی زد میں تھے۔ ہمیشہ اسی لطف و شگفتہ روئی سے گفتگو کی، جیسے پہلے کیا کرتے تھے۔ جالندھر میں قاتلوں اور ان کی ننگی تلواروں اور چھروں کا سامنا اور کس درجہ غیر طبعی المناک موت سے صرف چند لمحوں کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ دوسری طرف علی گڑھ میں قلب کا شدید دورہ پڑا اور یہ طبعی موت بالعموم جیسی غیر طبعی ہوتی ہے، کسے نہیں معلوم؛ لیکن دونوں آزمائشیں وہ اس طرح جھیل گئے جیسے "اک موجِ خوں وہ بھی۔"

ان بھائیوں میں شرافت، حمیت اور استقامت کے جوہر ان کی نسلی اور قبائلی صفات میں سے ہیں۔ دوسری طرف علم سے شغف اور اس کو اعلیٰ سطح تک پہنچانے کی مشکل و مبارک مہم کی سربراہی اور اس میں کامیابی بجائے خود ان کا بڑا قیمتی کارنامہ ہے۔ محمود صاحب نے جرمنی سے اور یوسف صاحب نے فرانس سے ڈاکٹریٹ لی اور پروفیسری پر فائز رہے۔ محمود صاحب حکومتِ پاکستان میں وزیر تھے اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ اب کراچی یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ یوسف صاحب جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر تھے اور سالہا سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر شپ کے فرائض انجام دیئے۔ ذاکر صاحب کے بارے میں کون کیا نہیں جانتا۔ تفصیل اس مجلّے میں

مل جائے گی۔

سوچتا ہوں، اگر تینوں موحوم بھائی زندہ رہتے اور ترقی کے جیسے آثار ان میں ہویدا تھے، ان کو برگِ و بار لانے کا موقع ملا ہوتا، تو آج ان کی موجودگی اور بے بہا خدمت سے ہمارے وزن و وقعت میں کتنا گرانقدر اضافہ ہوتا۔ زندگی کی شام میں ماضی کی یادوں کا کارواں ایک بار متحرک ہو جائے تو اس کو قابو میں لانا اور رکھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ایسا کرنا شاید گوارا بھی نہ ہوتا۔ خیال ہوتا ہے کہ ان تمام بھائیوں کے بے بہا کارناموں کو دیکھنے کے لیے ان کے والدین جنھوں نے اوسط سے بھی کم عمر پائی، بقیدِ حیات ہوتے، تو اقبالؔ کی زبان سے یہ کہنے میں کتنے حق بجانب ہوتے:

میرے گوہر تمام یکدانہ!

ذاکر صاحب ام اے او کالج میں بحیثیت طالب علم داخل ہوئے، تو پہلی جنگِ عظیم برپا تھی۔ ہندوستان میں ایک نیا سیاسی اور تہذیبی شعور بیدار ہو چکا تھا یہ نتیجہ تھا دادا بھائی نوروجی، سرسید، گوکھلے، تلک اور ان کے دوسرے جلیل القدر ہم عصروں کی بے مثل ذہنی و سیاسی قیادت کا جس کے طفیل ملک میں اعلیٰ صلاحیتوں کی حامل ایک نئی نسل وجود میں آ چکی تھی، اور عام ذہنوں میں قومی مقاصد و عزائم کا ایک دلکش اور واضح تصوّر جھلکنے لگا تھا۔ اس نئے ذہن اور جذبے کی ترجمانی اور قیادت گاندھی جی، محمد علی، ابوالکلام آزاد، موتی لال نہرو، مختار احمد انصاری، سی آر داس، ٹیگور، اقبال، سروجنی نائیڈو اور جواہر لال نہرو کر رہے تھے۔ ان کے اخلاص، اعتقاد، اولوالعزمی سے ہندوستان میں ایک ہمہ گیر ذہنی سیاسی تحریک کا آغاز ہوا جو بدیسی حکومت کو ہر قدم پر چیلنج کر رہی تھی۔ اس کا نہایت مؤثر اور قابلِ قدر اظہار حکومت کے خلاف اس سیاسی

ہندو مسلم اتحاد کی شکل میں ہوا، جیسے عام طور پر خلافت اور نان کو آپریشن کی تحریک، سے موسوم کرتے ہیں۔ اس کے مثبت اور منفی دونوں پہلو تھے، جن کی تفصیل کی یہاں نہ گنجائش نہ ضرورت۔ مجموعی حیثیت سے اس تحریک نے قومی آزادی کے بنیادی مقاصد کے حصول میں تاریخی خدمت انجام دی اور بدیسی حکومت کی گلو افشار گرفت کو ڈھیلا کیا۔ اس کے علاوہ مغربی ادب اور علم و فنون سے پچھلی صدی میں ہندی ذہن کا جو تعلق قائم ہوا تھا اور پہلی جنگ عظیم سے جو نئی صورت پیدا ہوئی تھی وہ اب ایک ایسی فکر، ایک ایسے جذبے اور ایک ایسی بصیرت کی شکل میں نمودار ہو رہی تھی، جس کو بحیثیت مجموعی قومی تہذیب و تمدن کی اہم اور معنی خیز بازیافت اور عالمی سیاسی و ذہنی رجحانات کے ایک نئے نامیاتی اور ناگزیر شعور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اس وقت کی سیاسی تصویر کو سامنے رکھیں تو کم و بیش تین واضح نقطۂ نظر کارفرما نظر آتے ہیں۔ ایک نقطۂ نظر انتہا پسندی کا تھا۔ اس کے کارکن یوں تو سارے ہندوستان میں تھے، لیکن ان کا دائرۂ عمل محدود تھا۔ ان کی موجودگی کا احساس بدیسی حکومت کے لیے بڑے تردد کا باعث تھا۔ گاہے گاہے ان کی شدید اور سنگین کاروائیاں ملک کی سیاسی فضا کو جھنجھوڑ دیا کرتی تھیں۔ اس کے جواب میں حکومت سخت اقدامات کرتی، تو اس کا ردِ عمل مزید عام سیاسی بیداری کی صورت میں ہوتا لیکن مجموعی طور پر ہندوستانی ذہن نے انارکسٹ تحریک کے طریقۂ کار کو اپنانے سے احتراز کیا۔ اس طور پر سیاسی جدوجہد کو یکسر خفیہ اور سازشی انداز اختیار کرنے سے محفوظ رکھا دوسرا نقطۂ نظر حکومت سے مفاہمت کر کے مراعات اور حقوق حاصل کرنے کا تھا۔ اس کے ماننے والوں میں ہر مذہب اور علاقے کے امیر امرا، نوکری پیشہ

اور زمیندار قسم کے لوگ تھے، جو اپنے چھوٹے بڑے مفاد کی خاطر حکومت کا تقرب اور تائید حاصل کرنے کے درپے رہتا ہے۔ ان کی تمام تر کوشش کا مقصد و ماحصل یہ ہوتا کہ ملک کے سماجی اور سیاسی نظام میں کوئی ایسی بڑی تبدیلی نہ ہونے پائے، جو ان کے مفاد اور مستقبل کو خطرے میں ڈال دے۔ اس لیے وہ ایک طرف حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کی مستقل کوشش و کاوش میں مبتلا رہتے اور دوسری طرف، اپنی فطری اور اکتسابی موقعہ شناسی کو کام میں لاکر اپنے گروہ یا صوبے کی رائے عامہ کو متاثر کرنے کے لیے وقت کے مناسب حال مسائل پیش کرتے اور ایک حد تک ان کو حل کرا کے اپنی سیادت کو متعین کراتے رہتے۔ اکثر یہ سب حکومت کے ایما سے ہوتا، لیکن اس چابکدستی اور خوبصورتی سے کہ اچھے بھلے لوگ اس سے متاثر ہوتے اور ان کی تائید کرتے۔ تیسرا نقطۂ نظر زیادہ واضح، مثبت اور قابلِ قدر انداز کا تھا۔ اس کے حامل ملک کی نجات، آزادی، جمہوریت اور مساوات میں تلاش کرتے تھے اور ایک با اصول تنظیم اور ہمہ گیر قومی سیاسی و ذہنی تحریک کا فروغ اور ایک پسماندہ معیشت اور معاشرے کو باقاعدہ طور پر کم از کم وقت میں ترقی کے اعلیٰ مدارج سے ہمکنار کرنا چاہتے تھے۔

اس زمانے کا تفصیلی جائزہ لینا تاریخ، سیاسیات، سماجیات اور معاشیات کے ماہرین کا کام ہے۔ میرا مقصد تو اس وقت کی مخصوص فضا اور نقشے کے بعض ایسے پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا ہے، جن سے اس وقت کے نوجوان خاص طور سے متاثر تھے۔ صورت خاصی پیچیدہ تھی اور فکر و عمل میں کسی فیصلہ کن نتیجے پر پہنچنا آسان نہ تھا۔ اس لیے کہ بنیادی طور پر ہندوستانی ذہن کی تعمیر و ساخت مختلف النوع احساسات، تصورات اور روایات سے ہوتی

تھی، جو بیک وقت اتنے بڑے ملک اور اس کی اتنے مختلف قماش و قرینے کی آبادی کے باہمی اختلاف و ارتباط کی ترجمان تھی۔ چنانچہ ہندوستان کی بڑی شخصیتوں کو اکثر یہاں کے اجتماعی قومی ورثے اور تاریخ کی ایسی تعریف و تعبیر پیش کرنے میں دشواری پیش آئی ہے، جو ملک میں مختلف رہنے بسنے والوں کے لیے یکساں طور پر قابلِ قبول ہو، اس لیے کہ مختلف عقائد، مختلف زبانوں اور مختلف رسم و رواج کی موجودگی میں مشترک اقدار کے احساس کو اس طور پر ذہنوں میں جاگزیں کرنا کہ وہ قومی مزاج و موقف بن جائے، آسان نہیں ہے۔ چنانچہ ہمارے اچھے سے اچھے آدمی کی نیت پر خود اس کے لوگوں نے شبہ کیا اور اس کے قول و فعل کو مخصوص مفادات کی پاسداری پر محمول کیا۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ مشترک تہذیب اور سرمائے کی توضیح و توسیع کے مبارک اور مہتم بالشان کام کے لیے جتنے بامقصد مشاہدے، جس گہرے مطالعے، جس وسیع ہمدردی، بے لوث عمل، گہری ریاضت اور محکم دوستداری کی ضرورت تھی، وہ ایک عرصے سے قوم کی سیاسی اور تہذیبی زندگی میں عام طور سے موجود نہ تھی۔

یہ اس صورتِ حال کا ایک اجمالی نقشہ ہے، جس سے ذاکر صاحب کا بحیثیت ایک ذہین، مخلص اور حوصلہ مند نوجوان طالب علم کے سابقہ ہوا۔ کالج میں ذاکر صاحب کا شمار اس وقت کے مثالی طلبہ میں تھا۔ ساتھی طلبہ بڑی عزت و محبت کرتے تھے اور اساتذہ ان کی غیر معمولی ذہانت، قابلیت اور سیرت کا خاص طور پر لحاظ رکھتے تھے، باوجود اس کے کہ اس زمانے کا یورپین اسٹاف ذاکر صاحب کے نمونے کے طلبہ سے کچھ زیادہ خوش گمان نہیں رہتا تھا۔ سبب یہ تھا کہ صورتِ حال کیسی ہی ہو، ذاکر صاحب حفظِ مراتب

کے آداب اور تقاضوں کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ خدا نے ان کو جن صفات سے نوازا تھا، خود کو اس کا اہل اور شکر گزار ثابت کرنے کے لیے انہوں نے جس مجاہدۂ نفس، احتسابِ عمل، اور احساسِ ذمہ داری کو تمام عمر اپنی زندگی کا شعار بنائے رکھا، اسے ان کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھنا چاہیے۔ آدمی کی بڑائی اس سے بھی پہچانی جاتی ہے کہ قدرت کی دی ہوئی نعمتوں کو وہ کس طرح اور کس مقصد کے لیے کام میں لاتا ہے ـــــ اپنی نمود و بہبود کا وسیلہ بناتا ہے، یا ان کو اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے وقف رکھتا ہے۔ جس سے ضرورت مند زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں ذاکر صاحب ہمیشہ موخر الذکر طبقے میں نہایت ممتاز درجے پر پائے گئے۔ شباب کے نشہ و نشاط کو خدمتِ خلق کے صوم و صلوٰۃ پر نثار کر دینا آسان نہیں۔

ذاکر صاحب اس ادارے کے طالب علم رہ چکے ہیں، جو نہ صرف ایک مستند، مقبول اور اس وقت سے اب تک ایک عدیم المثال اعلیٰ ماڈرن تعلیمی ادارے کی حیثیت رکھتا ہے، بلکہ ہندوستانی تہذیب کے ایک مخصوص اور مبارک پہلو کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔ علی گڑھ مسلمانوں کے تعلیمی و تہذیبی مقاصد کا مرکز اور سرچشمہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے وسیلے سے ملک کی ناموری اور خوش حالی میں ساتھی رہنے بسنے والوں سے توافق و تعاون کا متمنی بھی رہتا ہے اور مبلغ بھی۔ حسبِ حال و ضرورت جدید تعلیم دینے اور پھیلانے کا حامی، سرسید سے زیادہ ان کے عہد میں شاید ہی اور کوئی رہا ہو۔ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ملک کی حقیقی اور ہمہ جہتی ترقی کے لیے تعلیم کو شرطِ اولین قرار دیا اور ہندوستان جیسے ملک کی ترقی و ترفع کے پروگرام میں تعداد اور طاقت کو اتنی اہمیت نہیں دی، جتنی حقیقی اور عام تعلیم و تربیت

کو اور سرسید کا تعلیم کا یہ تصور اعلیٰ اور دوررس امکانات کے اعتبار سے کتنا صحیح تھا۔

اس طور پر زمانۂ طالب علمی ہی میں ذاکر صاحب کو مسلمانوں کی ذہنی، اخلاقی اور سیاسی زندگی کے جملہ نشیب و فراز اور اہم شخصیتوں اور مکاتب فکر سے براہِ راست آشنا ہونے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ وہ مشترک و مستحسن خاندانی روایات تھیں جو یہاں کے طلبہ اپنے اپنے گھروں سے لاتے تھے، اسلاف کے وہ کارنامے تھے جو انہوں نے بزرگوں میں دیکھے، ان سے سنے، اور کتابوں میں پڑھے، جن کی دور اور نزدیک طرح طرح کی نشانیاں بکھری ہوئی نظر آتی تھیں، اور وہ اچھے اور بڑے لوگ جو کالج کے ساختہ پرداختہ تھے، یا جنہوں نے کالج کی ساخت و پرداخت کی تھی، کالج کی نیک نامی اور خوشحالی کو اپنی نیکنامی اور خوشحالی جانتے تھے اور موقع آنے پر دفاعی دستے اور انجمن صلیب احمر (RED CROSS) دونوں کے فرائض انجام دیتے تھے۔ یہ سارے عوامل براہِ راست یا بالواسطہ ذاکر صاحب کے شعور پر اثر انداز تھے، اور کتنی مفید و مؤثر دن رات کی وہ صحبتیں تھیں، جو ان کو کالج میں منتخب مسلمان شریف طبقے کے ذہین اور حوصلہ مند ساتھی نوجوانوں کی حاصل تھیں، جہاں وہ اپنی اعلیٰ ذہنی و اخلاقی صلاحیتوں کو، اپنے ساتھیوں کے اعلیٰ ذہن و اخلاقی صلاحیتوں سے براہِ راست و ہمہ وقت کسر و انکسار میں بنتے اور سنورتے پاتے تھے۔ انسان اور اس کی زندگی کے مسائل کتنی وسعت، کتنا تنوع اور کتنی گہرائی رکھتے ہیں اور فرد و جماعت کے روابط کو کس طرح استوار کرتے اور بابرکت رکھتے ہیں، ان کا بتانا آسان نہیں ہے لیکن ذاکر صاحب کی شخصیت اور زندگی میں ان کی واضح جلوہ گری ملتی ہے۔

ذاکر صاحب کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی زندگی کے ہر پہلو سے گہری

وابستگی رکھتے تھے اور اس کی تمام دلچسپ اور صحت مند سرگرمیوں میں اس انہماک سے حصہ لیتے جیسے وہ ان کا بڑا محبوب مشغلہ ہے۔ کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، ٹینس میں جو کالج کی زندگی میں بڑے مقبول مشاغل تھے، عملاً کوئی حصہ نہیں لیتے تھے لیکن ان سے لطف اٹھانے اور ان کے اسرار و رموز یا لطائف و ظرائف پر دلچسپ گفتگو کرنے میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ کوئی میچ یا تقریب کالج میں کہیں منعقد ہو، اس کے تماشائیوں میں ذاکر صاحب ضرور ہوتے۔ کسی قابلِ قدر ہنر کا ماہرانہ ادراک ہو یا نہیں، اس کے ہنروروں کے بڑے قدردان تھے اور اب بھی ہیں۔

کالج کی ابتدائی نصف صدی کی اقامتی زندگی اس ادارے کا بڑا قیمتی، بے مثل اور دلکش امتیاز تھا، جو اس وقت تک کسی دوسرے ادارے کے حصے میں نہیں آیا تھا۔ یہ وہ رشتہ ہے جو ایک طرف اس کے نوجوانوں کو ایک ناقابلِ شکست شیرازے میں منسلک رکھتا ہے، دوسری طرف اس کے ناموس کا نگہبان اور نشان بھی ہیں۔ ذاکر صاحب اس ادارے کی اسی ابتدائی نصف صدی کی اقامتی زندگی کی پیداوار ہیں، جب یہاں کی فضا محکم عقیدہ، صالح روایات، شائستگی، حوصلہ مندی اور وسیع النظری سے معطر و منور تھی۔ یہ عہد ام اے او کالج کی شادمانی، شہرت و شوکت کا سب سے نمائندہ نمایاں اور ناقابلِ فراموش عہد تھا۔

ذاکر صاحب اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ سے انٹرنس پاس کر کے علی گڑھ آئے تھے۔ طلبہ کے پسندیدہ اخلاق و اطوار، اساتذہ کی فرض شناسی اور طلبہ سے ہمدردی اور دوسری قابلِ قدر روایات کے اعتبار سے اٹاوہ علی گڑھ کا مثنیٰ کہا جاتا تھا۔ اس کے مشہور اور نیک نام ترین ہیڈ ماسٹر سید اسطاق حسین مرحوم کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ان کے طلبہ ان کی جتنی عزت و محبت کرتے

تھے، کسی اور زندہ شخص کی نہیں کرتے تھے۔ ذاکر صاحب کی ذہنی و اخلاقی صلاحیتوں کو سنوارنے اور استوار کرنے میں سید الطاف حسین کی توجہ و تربیت کا بڑا قیمتی حصہ ہے، جس کا اعتراف ذاکر صاحب نے ہمیشہ بڑے احترام و عقیدت سے کیا۔

کالج سے ذاکر صاحب نے انٹرمیڈیٹ سائنس میں کیا۔ اس وقت ان کا ارادہ لکھنؤ میڈیکل کالج میں داخلہ لے کر ڈاکٹری کا کورس پورا کرنے کا تھا۔ لیکن بعد میں ارادہ بدل دیا اور علی گڑھ واپس آکر بی اے میں داخلہ لے لیا، جس میں ان کے مضامین انگریزی ادب، معاشیات اور فلسفہ تھے۔ ان مضامین سے ان کو فطری مناسبت تھی۔ ان کا مطالعہ انہوں نے بڑی محنت سے کیا ہو یا نہیں، بڑے شوق سے ضرور کیا۔ یہ اس لیے کہنا پڑا ہے کہ ذاکر صاحب طالب علمی کے عہد میں کسی مضمون یا تصنیف کا مطالعہ اتنی محنت سے نہیں جتنا شوق سے کرتے تھے۔ انہوں نے علم و فن میں جو عرفان و آگہی حاصل کی، اس سے معمولی دکانداروں کی طرح اتنا خود فائدہ نہیں کمایا، جتنا اس علم و فن کے حدود کو آگے بڑھایا۔ بی۔ اے کے امتحان میں نمایاں امتیاز حاصل کیا اور کالج میں اوّل آئے۔ ام اے میں معاشیات کا انتخاب کیا۔ طالب علمی ہی کے زمانے میں ٹیوٹر مقرر ہوئے، اس کے ساتھ قانون کے پہلے سال کا امتحان پاس کیا۔ اسی زمانے میں افلاطون کی مشہور کتاب ریاست کا ترجمہ اردو میں کیا، جسے بعد میں انجمن ترقی اردو نے شائع کیا۔ اس پر ذاکر صاحب نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ معانی و مطالب، نیز اسلوب اظہار و ابلاغ کی رُو سے بڑی فکر انگیز و دل کش تحریر ہے کچھ ایسا خیال ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کے اس عہد کے ذہنی نشو و نما میں افلاطون اور ان کے استاد سقراط کی شخصیات اور عظیم فلسفیانہ افکار کا بڑا حصہ ہے

ذاکر صاحب کو ہر اچھے خیال، عمل اور شخصیت سے کچھ ایسی مناسبت ہے اور ان کا ذہن بجائے خود اتنا اخاذ، خلاق، حسن کار اور حسن آفریں ہے کہ بڑے سے بڑا خیال یا شخصیت ان کے فکر و عمل میں بڑی خوبصورتی سے پیوست ہو کر ایک نئی شان اور ایک نئی معنویت حاصل کر لیتی ہے۔

اس موقع پر اپنے ایک اور ایک احساس کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ ابتدائے طالب علمی سے آج تک سر سید کی شخصیت، ان کے رفقائے کرام اور ان کے بنائے ہوئے ادارے سے مجھے جو شغف ہے، اس میں جہاں اور بہت سے عوامل کی کارفرمائی ہے، وہیں ذاکر صاحب کی شخصیت کو بھی بڑا دخل ہے جو تمامتر علی گڑھ کی فضا میں بالیدہ و برومند ہوئی اور علی گڑھ اور اس کے بانی کے بہترین آرزوؤں کی مظہر ہے۔ سر سید کی وہ آرزوئیں کیا تھیں اور کیسی تھیں، ان پر یہاں بحث کرنے کی بجائے اس پر منصفی سے غور کرنا چاہیئے کہ سر سید نے تعلیم و تربیت کے اعلیٰ، علمی، اخلاقی اور قومی تصور کے پیش نظر جو پروگرام ہندوستان میں رہنے بسنے والے مختلف مذہب و مسلک کے پیروؤں کے لیے مرتب کیا اور اس کا نفاذ علی گڑھ میں جس خلوص اور جوش عمل سے کیا اور جس پر آج تک عمل ہو رہا ہے، اس کی مثال ہندوستان میں آج اکیانوے سال بعد بھی کہیں نظر آتی ہے یا نہیں۔ شاید یہ بات کچھ لوگوں کو عجیب معلوم ہو اس لیے کہ تحریک عدم تعاون کی پیروی میں علی گڑھ کو خیر باد کہہ کر ذاکر صاحب جامعۂ ملیہ اسلامیہ سے منسلک ہو گئے، جو ایک طور پر علی گڑھ کی مخالفت میں قائم کی گئی۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جامعۂ ملیہ کا قیام خود فرزندانِ علی گڑھ کا کارنامہ تھا۔ محمد علی، شوکت علی، عبدالمجید خواجہ اور ذاکر صاحب — یہ سب علی گڑھ ہی کے تھے۔ یکسر بدلے ہوئے حالات میں قومیت کے بے پناہ

جذبے کو ایک مثبت تعلیمی تحریک کی شکل دینا، اس کے لیے مصیبت اٹھانا، ایثار و خدمت کی مبارک اور شاندار روایت قائم کرنا جس نے ہندی مسلمانوں کی جدید ذہنی و اخلاقی تربیت میں ایک اہم کردار ادا کیا، علی گڑھ کے تعلیمی مشن کی، علی گڑھ والوں ہی کی کوشش سے، مزید توسیع تھی۔

ذاکر صاحب نے غالباً اکتوبر ۱۹۲۰ء میں کالج چھوڑا اور قومی تعلیم و ترقی کو اپنا شعار بنایا اور خود کو اس کے لیے وقف کر دیا۔ اس وقت ایسا کرنا ایک نہایت درجہ دشوار اور صبر آزما راستے کو اختیار کرنا تھا، لیکن انھوں نے یہ سب اتنے شوق، خلوص اور قابلیت سے کیا جیسے ان کو اسی دن کا انتظار تھا۔ ایک خالص سیاسی تحریک کے طوفان کو تعلیم و تہذیب کی جوئے رواں میں تبدیل کر دینا آسان نہ تھا۔ ان کے اس اقدام میں علی گڑھ کے پیرِ دانا کے حسنِ خیال اور جوشِ عمل کی صداقت، عظمت اور قومی ہمدردی کی بڑی مبارک نشانیاں ملتی ہیں، جس نے قوم کی ذہنی و اخلاقی تربیت کو ہر چیز پر مقدم رکھا اور اس طور پر سیاست کو تعلیم کا خادم اور تابع بنا کر قومی تہذیب کے تخلیقی ارتقا کے امکانات کو واضح اور روشن کیا۔ قومی تہذیب کی محرک و مؤید صحیح معنوں میں اعلیٰ تعلیم ہی ہوتی ہے۔ علی گڑھ تحریک دراصل اسی نکتے کا ایک دلنشین اظہار تھی۔ ذاکر صاحب نے جو فیصلہ کیا تھا، اس کے پیشِ نظر ان کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ قبل اس کے کہ وہ جامعۂ ملیہ کے کاموں کو سنبھالیں، انھیں مزید تعلیم و تجربہ کے لیے باہر جانا چاہیے تاکہ عصری مغربی تعلیم و تہذیب سے واقفیت نہ ہونے کے سبب سے ایسی دقتیں پیش نہ آئیں جو آئندہ ایک ترقی پذیر تعلیمی پروگرام کی تشکیل و تحصیل میں مانع ہوں۔

۱۹۲۲ء میں ذاکر صاحب جرمنی کے لیے روانہ ہوئے اور برلن یونیورسٹی

میں پی ایچ ڈی کی سند لینے کے لیے داخلہ لیا۔ ساڑھے تین سال وہاں مقیم رہے۔ اس عرصے میں نہ صرف یہ کہ "برطانوی ہند میں زراعت" کے موضوع پر تحقیقی مطالعہ پیش کر کے ڈاکٹریٹ حاصل کی، بلکہ جرمنی اور دوسرے ملکوں کی تہذیب و تمدن بالخصوص ان کے تعلیمی نظام کا گہرا مطالعہ کیا۔ جن لوگوں نے ذاکر صاحب کو وہاں دیکھا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے اس دوران میں ان تعلیمی تجربات کا خاکہ تیار کیا جو بعد میں ان کی رہنمائی میں جامعہ میں نافذ کیے گئے۔ یہاں بھی ذاکر صاحب کے عمل کا یہ انداز سر سید کے اس طریق عمل سے کس درجہ مماثلت رکھتا ہے جو ان کے قیام انگلستان میں بروئے کار آیا جہاں سر سید نے اپنا تمام وقت اور توجہ قوم کے سود و بہبود سے متعلق تعلیمی پروگرام مرتب کرنے میں صرف کیا۔ برلن یونیورسٹی میں ذاکر صاحب کے استاد مشہور جرمن ماہر معاشیات زومبارٹ (PROFESSOR SOMBART) تھے جن کی اس وقت کے جرمنی کے اعلیٰ علمی حلقوں میں بڑی منزلت تھی۔ اقتصادیات میں پروفیسر موصوف کا مخصوص مطالعہ معاشی نظام، خاص طور پر سرمایہ داری نظام کے ارتقا، اس کی ہیئت، طریقۂ کار اور مقاصد سے متعلق تھا اور ان موضوعات پر ان کی بڑے معرکے کی تصانیف ہیں جن میں سے بعض کا انگریزی ترجمہ ہو چکا ہے۔ پروفیسر زومبارٹ کے علاوہ ان کے دوسرے پروفیسر پروفیسر زیرنگ (PROFESSOR SERING) تھے جن کی نگرانی میں ذاکر صاحب نے ڈاکٹریٹ کا مقالہ "زراعتی معاشیات" لکھا تھا۔ پروفیسر زومبارٹ کے خیالات کا ذاکر صاحب کے اقتصادی نظریات پر نمایاں اثر پڑا۔ اس کا اندازہ ذاکر صاحب کے ان دو لکچروں کے مطالعے سے ہوتا ہے، جو انھوں نے مختلف موقعوں پر دیے اور بعد میں شائع بھی ہوئے پہلے

لکچر ہندوستانی اکڈیمی الہ آباد کی فرمایش پر دیے گئے جو "معاشیات: مقصد و منہاج" کے نام سے اردو میں چھپے؛ دوسرے لکچروں میں جو کیکا بھائی پریم چند جی لکچر کے نام سے دہلی یونیورسٹی کی دعوت پر (CAPITALISM: ESSAYS IN UNDERSTANDING) کے عنوان سے دئے گئے۔ ان کے علاوہ انھوں نے معاشیات کی دو مستند کتابوں کا ترجمہ کیا: ایک ایڈورڈ کینن (EDWARD CANNAN) کی "اصولِ معاشیات" اور دوسری فریڈرش لسٹ (FRIEDRICH LIST) کی کتاب "معاشیات قومی" کا۔ اس طور پر کہہ سکتے ہیں کہ معاشیات میں ذاکر صاحب کی خصوصی دلچسپی ان مضامین سے تھی، جو بنیادی طور پر فلسفیانہ معاشیات یا معاشی عمرانیات سے متعلق تھے۔ یوں ان کا معاشیات کا عام مطالعہ نہایت وسیع ہے اور وہ ان تمام جدید تبدیلیوں سے پورے طور پر آشنا ہیں جو اس علم میں بڑی تیزی سے راہ پاتی رہی ہیں، جن کو سمجھنے کے لیے مخصوص و مسلسل مطالعہ درکار ہے۔

ذاکر صاحب کی دوسری دلچسپی تعلیم کے مضمون سے تھی۔ بعد میں کچھ ایسا ہوا کہ معاشیات کے بجائے تعلیم ہی ان کا خاص مضمون بن گئی۔ یہاں تک اب ملک کے اندر اور باہر وہ ایک ممتاز ماہر تعلیم کی حیثیت سے زیادہ جانے پہچانے جاتے ہیں اور یہ صحیح بھی ہے۔ جرمنی سے واپس آکر انہوں نے تعلیم کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا اور عمر کا بیشتر اور بہترین زمانہ اسی کی نذر کیا۔ یہاں تک کہ جدید ہندوستانی تعلیمی نظام کی تشکیل و تعمیر میں ان کے تعلیمی افکار کو جا بجا طور پر بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس موضوع پر ذاکر صاحب نے اردو میں جو کچھ لکھا وہ "تعلیمی خطبات" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی میں متعدد لکچر ہیں جو کتابی شکل میں یکجا نہیں ملتے، لیکن شائع ہو چکے ہیں،

اور ملک کے تعلیمی حلقوں میں معروف و مشہور ہیں۔ حال میں ان کی ایک کتاب (THE DYNAMIC UNIVERSITY) کے نام سے انگریزی میں شائع ہوئی ہے جو ان کی تخلیقِ فکر کا قابلِ قدر نمونہ ہے۔ ان کے علاوہ ملک کی تعلیم کے سلسلے میں ذاکر صاحب کی تاریخی خدمت اسی رپورٹ سے عبارت ہے، جو گاندھی جی کے ایما پر مرتّب ہوئی اور عام طور پر "واردھا ایجوکیشن رپورٹ" کے نام سے معروف ہے۔

ذاکر صاحب کے تعلیمی افکار و نظریات کی ابتدائی تشکیل و تعمیر میں اس گہرے مشاہدے اور مطالعے کو خاص دخل ہے، جو ان کو جرمنی کے زمانۂ قیام میں میسّر آئے۔ اس میں دو نام قابلِ ذکر ہیں، جن سے ذاکر صاحب گہرے طور پر متاثر ہوئے۔ ایک مشہور جرمن عالم کرشن اسٹائنر (KERCHANSTEINAR) دوسرے ممتاز و معروف سوئٹزرلینڈ کے ماہرِ تعلیم پستالوزی (PESTALOZZI)

اس وقت وہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے، اس لیے وہ جامعہ کو ایسا ادارہ بنانا چاہتے تھے جو ملک میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی نہ صرف بنیادی تعلیم گاہ بلکہ تجربہ گاہ بھی ہو۔ قومی سیرت اور ذہن کی اساسی تعمیر اصلاً ابتدائی اور ثانوی تعلیم ہی کے ذریعے ہوتی ہے۔ معاشی اور سماجی اعتبار سے ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے، جس کی تین چوتھائی سے زیادہ آبادی دیہات میں بود و باش رکھتی ہے۔ انگریزی حکومت نے جو نظامِ تعلیم رائج کیا تھا، وہ کل آبادی کی صرف ایک محدود تعداد کی تعلیمی ضرورتوں کو بھی ناکافی حد تک پورا کرتا تھا۔ ذاکر صاحب اس کمی کو شدّت کے ساتھ محسوس کرتے تھے۔ ان کی آرزو اور کوشش یہ تھی کہ قومی ترقّی اور فلاح کے لیے ایک ایسے جامع تعلیمی منصوبے کی تشکیل کی جائے، جو بچّوں کی آزاد، صحت مند اور مبارک ذہنی و جسمانی نشو و نما

اور تربیت میں اعلیٰ قومی اقدار اور ایک حر کی معاشرے کو فروغ دینے میں معین ہو۔

ذاکر صاحب ہندوستان واپس آئے، تو یوروپ کی بہترین متاع یعنی ترقی یافتہ تعلیمی افکار و نظریات اپنے ساتھ لائے، اور آتے ہی اپنے وعدے اور منصوبے کے مطابق جامعہ کے کاموں کو سنبھال لیا۔ یہ مہم جتنی اہم تھی، اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مادّی ذرائع اور وسائل کی اتنی ہی کمی تھی۔ جن لوگوں نے یہ کام شروع کیا تھا، ان کی ہمّت جواب دے رہی تھی، ابتدائی جوش اور ولولہ سرد پڑ رہا تھا، ملک کی سیاسی فضا تیزی سے مکدّر ہو رہی تھی، اور جامعہ کو پروان چڑھانا ناممکن نظر آ رہا تھا۔ یہ محض ذاکر صاحب کی شخصیت کا اعجاز تھا کہ تھکے ہارے ساتھی تازہ دم ہوئے اور انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں ایک عہد آفریں تعلیمی پروگرام کو کامیاب بنانے کی عظیم مہم میں دل و جان سے شریک ہو گئے۔ جن لوگوں نے ذاکر صاحب کے وہ دن رات دیکھے ہیں ان کو یاد ہو گا کہ جانبازوں اور ان کے شیخ نے کتنے دل شکن حالات میں کس دلجمعی اور پامردی کا ثبوت دیا۔ رضا کارانہ طور پر اپنے کو بے سروسامان رکھ کر قوم کے لیے کیسے ساز و سامان فراہم کیے۔ پسینہ پانی ایک کر کے کتنی سنگلاخ زمین کو کتنا زرخیز بنا دیا اور اتنا کچھ کر ڈالنے کے بعد اپنا کوئی حق نہیں جتایا۔ علم، تہذیب اور انسانیت کی خاطر اس جماعت نے جو کچھ کر دکھایا، اس کی یاد ملک و قوم کے دلوں کو ہمیشہ تازہ اور توانا رکھے گی۔

علی گڑھ سے جامعہ دہلی منتقل ہوئی، تو قرولباغ کے علاقے میں کرائے کے مکانات میں اس کا کام شروع ہوا۔ غالباً اس کی اپنی عمارت کوئی نہ تھی۔ اسکول اور کالج کہیں تھے، تو دفتر اور اقامت گاہیں کہیں اور تعلیم بالغان کا

دفتر یہاں تھا تو مکتبۂ جامعہ وہاں۔ لیکن ان دشواریوں کے باوجود جامعہ کا کام دیکھیے، تو نہایت درجہ منظّم، مرتّب اور بامقصد ادارے کا احساس ہوتا تھا۔ ہر کام قاعدے اور وقت کی پابندی سے انجام پاتا تھا۔ بحیثیت مجموعی اس زمانے میں قرولباغ کی بستی بڑی ناصاف، ناصحت مند، وحشت انگیز اور ویران تھی، لیکن جامعہ کے طفیل اس کی خرابیاں ماند پڑ گئی تھیں۔ وہاں جائیے، تو جامعہ، ذاکر صاحب، ان کے رفقاء اور ان کے کاموں کے تصوّر سے ایسا محسوس ہوتا جیسے پورے علاقے کی فضا جامعہ کی فضا میں تبدیل یا تحلیل ہوتی جارہی ہو۔ جامعہ والے اس بستی کو اپنی بساط اور وسائل سے زیادہ صاف ستھرا رکھنے کی کوشش کرتے، ذاکر صاحب کا مکان بہت مختصر، لیکن اندر باہر صفائی، سادگی اور سلیقے کا نمونہ تھا۔ ذاکر صاحب کی بوریہ نشینی میں سلطان کی شان تھی۔ جو ملنے جاتا، اسے احساس ہوتا کہ قوم کی تقدیر و تاریخ میں وہ مبارک موڑ آچکا ہے، جس کے ہم منتظر و متمنی تھے، اور اب جب کہ وہ مسندِ حکومت پر متمکن ہیں، صدر جمہوریہ کا ایوان اتنا مرکزِ حشمت و قوّت نہیں معلوم ہوتا، جتنا ایک ایسے امن کا جہاں اعلیٰ مقاصدِ قومی کا تعیّن اور ان کے حصول کی مناسب تدابیر عمل میں آتی ہیں اور جس کا مکین نئے ہندوستان میں ایک مہذّب، منصفانہ اور صلح کل معاشرے کا نقیب بھی ہے اور نمائندہ بھی۔

ذاکر صاحب کی قیادت میں رفتہ رفتہ ملک میں جامعہ کی ساکھ قائم ہوئی۔ اس کی افادیت اور اہمیت کا احساس عام ہونے لگا دلّی کے ہجوم و ہیجان اور دار و گیر سے دور اد کھلے میں ایک وسیع قطعے پر اس کی عمارتیں بننا شروع ہوئیں، اور دیکھتے دیکھتے ایک اجلی، ستھری، تعلیمی بستی آباد ہوگئی جامعہ کی عمارات دلّی کی تاریخی و تہذیبی عمارات کی نمائندگی کرنے کے ساتھ

ذاکر صاحب کے اعلیٰ تعمیری ذہن اور ذوق کا پتہ دیتی ہیں۔ ہیئت و ساخت اور ان کے معنی و متن میں ذاکر صاحب کے امید و عزائم پیوست ہیں۔ حالی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کو سرسید نے بڑے چاؤ اور امنگ سے بنایا جیسے کوئی اپنا گھر بناتا ہے اور وہ خود اس کے انجینئر، معمار، مزدور اور قلی تھے۔ کم و بیش یہی کیفیت ذاکر صاحب کی تھی۔ جامعہ کو گھر مل گیا، کاموں میں وسعت اور برکت ہوئی، اس طور پر ملک میں ایک صحت مند اور امید افزا روایت کا اضافہ ہوا۔

جامعہ نے غالباً ۱۹۴۶ء میں اپنی زندگی پچیس سال پورے کیے، تو اس کی خدمات کے اعتراف میں ایک جشن منایا گیا۔ کس آشوب و آزمایش کا وہ دور تھا۔ ملک میں سیاسی منافرت و عداوت اس درجہ پھیل گئی تھی کہ ایسا معلوم ہونے لگا تھا جیسے یہاں نہ کبھی یگانگت تھی، نہ ہو سکتی تھی۔ ایسے میں کسی ایسی تقریب کی طرح ڈالنا جس میں سب اتفاق و یکجہتی سے شریک ہوں، ناممکن العمل نظر آتا تھا اسے ذاکر صاحب اور ان کے ادارے کی کرامت کہنا چاہیے کہ ان کی دعوت پر جامعہ کے اس جشن حویلی میں سبھی شریک ہوئے۔ ڈائیس پر کون نہیں موجود تھا۔ جواہر لال نہرو، محمد علی جناح، راج گوپال آچاری، مولانا ابوالکلام آزاد، سید حسین نواب بھوپال، یاقت علی خاں، عبدالمجید خواجہ، اس زمانے کی عصبیاں و عداوت کے سیل کو ذہن میں رکھیں تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ جہاں پنڈت جواہر لال نہرو اور محمد علی جناح یکجا نظر آئیں، وہاں کیسے کیسے لوگ یکجا ہو گئے ہوں گے۔

ذاکر صاحب ان دنوں علیل تھے، خطبہ پڑھنے اٹھے تو سب کی نظریں ان پر جم کر رہ گئیں۔ وہ خطبہ بھی کیا تھا! اور اس میں کیا کچھ نہ تھا۔ کتنی فکر انگیز اور سچی باتیں، کس خلوص، اعتماد اور دردمندی سے، کتنا سچا اور پکا آدمی، قوم ملک کے

کس قدر نمائندہ مجمع کے سامنے پیش کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے یہ معلوم ہوا جیسے اس طوفان کا منہ پھر جائے گا، جو ہر اچھے فکر و عمل کو تہ و بالا اور تہس نہس کر رہا تھا، اور امید و الفت کا وہ سورج جو گہنا رہا تھا، از سر نو جگمگانے لگے گا۔ سب کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے قوم کا ضمیر خود قوم سے مخاطب ہو۔ ذاکر صاحب کی اس تقریر سے طوفان تو نہ تھما، اور جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا لیکن ملک کی آئندہ تاریخ جو لکھی جائے گی، اس میں اس حقیقت کا اظہار ہوگا کہ اس پر محن دور میں انصاف، شرافت اور انسانیت کی حمایت میں، ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر، جن لوگوں نے اپنی آواز بلند کی اور تعصب، تنگ دلی اور جہالت سے نبرد آزما ہوئے ان میں ذاکر صاحب کا نام بہت ممتاز ہے

جامعہ کی عام رہنمائی اور اس کے کاموں کی مسلسل نگہداشت کے علاوہ ذاکر صاحب کی بے شمار مصروفیات تھیں۔ واردھا تعلیمی رپورٹ کے شائع ہو جانے کے بعد خاص طور پر جب کانگریس نے غالباً ۱۹۳۷ - ۱۹۳۸ء کے ہری پورہ سشن میں اس کو پارٹی پروگرام کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا، ذاکر صاحب پر ذمہ داری کا ایک بوجھ آن پڑا۔ ملک کے دور دراز علاقوں کا سفر کرنا پڑتا تھا۔ مختلف جلسوں اور اداروں میں رپورٹ کی وضاحت کرنی ہوتی اور بحث مباحثے میں حصہ لینا پڑتا تھا۔ گاندھی جی نے جن کی بے شمار مصروفیتیں تھیں اس لیے بنیادی تعلیمی پروگرام کی سربراہی کا سارا کام ذاکر صاحب کو سونپ دیا تھا۔ گاندھی جی کے اس اعتماد کا ذاکر صاحب پر بڑا اثر تھا۔ دونوں اعلیٰ اخلاقی رجحان رکھتے تھے اس لیے ان کی تمام تر کوشش یہ تھی کہ ملک میں بنیادی تعلیمی پروگرام کو پارٹی یا اس کی حکومت کے اثر و اقتدار کو کام میں لا کر نافذ نہ کیا جائے، بلکہ آزاد بحث مباحثہ اور افہام و تفہیم کے ذریعے اس سے صحیح واقفیت پیدا کرائی جائے

اور یہی طریقۂ کار خیال اور عمل میں حقیقی اتحاد و یکجہتی کا باعث ہوگا۔ یوں بھی ذاکر صاحب کو محض اپنی بات منوانے کی اتنی فکر نہیں ہوتی جتنی زیرِ بحث مسئلے کے تمام پہلوؤں کی تشریح، وضاحت اور اس کے اسباب و نتائج کو دوسروں کو سمجھانے کی۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، بنیادی تعلیم کے منصوبے کا مقصد ملک میں ابتدائی تعلیم کو یکسری اور صحت مند بنیادوں پر قائم کرنا تھا اور نوخیز نسل کو بامقصد، بامعنی اور تخلیقی صلاحیتوں کے نشو و نما سے بہرہ مند کرنا تھا۔ عام ذہن مروّجہ تعلیمی نظام میں معمولی تبدیلیوں ہی کو کافی سمجھتا تھا، اس لیے جب یہ پروگرام سامنے آیا، تو کچھ عدم واقفیت کی بنا پر اور کچھ اس لیے کہ دیرینہ مفادات کو اس تبدیلی سے نقصان پہنچے گا، اکثر مذہبی نقطۂ نظر یا سیاسی عصبیت کے باعث اس کی طرح طرح سے تاویلیں کی گئیں اور مخالفت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ذاکر صاحب کو اس اسکیم کی جوابدہی کرنی پڑتی تھی۔ اس حوصلہ شکنی اور صبر آزما صورتِ حال سے ذاکر صاحب جس مستقل مزاجی اور قابلیت سے عہدہ برآ ہوئے وہ ان کا بڑا قابلِ تعریف کارنامہ ہے۔ ملک میں جا بجا بنیادی تعلیم کا کام شروع ہوا۔ لیکن اتنے بڑے ملک میں اتنے بڑے کام کو ہر جگہ یکساں کامیابی سے پھیلانے میں بے شمار دشواریاں حائل تھیں۔ پھر یہ کہ سیاست اور مذہب کے "دریائے بے پایاں و طوفانِ موج افزا" میں تعلیم کی کشتی زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ بنیادی تعلیم کا کام جن توقعات اور حوصلے کے ساتھ شروع کیا گیا تھا وہ پورا نہ ہوا، لیکن اس کی ذمہ داری ان پر نہیں ہے جنہوں نے اسے وضع کیا تھا بلکہ ان پر ہے جو اسے چلا نہ سکے۔

اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہوا، تو ذاکر صاحب دلّی میں

تھے۔ بحالیِ صحت کے لیے کشمیر جا رہے تھے کہ جالندھر کا حادثہ پیش آیا جس کا ذکر ابتدائی صفحات میں میں آچکا ہے۔ دلّی واپس پہنچے تو عالم انتخاب میں، یہ شہر دہشت اور درندگی کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ مسلمانوں پر قہر و قیامت کا صور مسلسل پھونکا جا رہا تھا۔ ان کے لیے عرصۂ حیات قبر کی طرح تیرہ و تنگ ہو چکا تھا اور دلّی کا گنج شہیداں، گنج شہیداں کا سماں پیش کر رہا تھا۔ مسلمان پارہ پارہ ہو چکے تھے۔ شقاوت و شیطنت کے اس مکروہ و مہیب منظر کے ساتھ انسانیت، غیرت اور محبت کی جھلک بھی دیکھنے میں آتی تھی۔ گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو، ذاکر صاحب، مولانا حفظ الرحمٰن، شفیق الرحمٰن قدوائی بے بس اور بے سہارا مسلمانوں کو پناہ اور تشفی دینے کے لیے ہر انجام و انعام سے بے پروا ہو کر سینہ سپر تھے۔ بالآخر آگ، خون اور خباثت کا عفریت قابو میں آیا لیکن کس طرح، کس وقت اور کس قیمت پر؟ ہندوستانی انسانیت کی سب سے گرانمایہ شخصیت، عالمگیر صلح و آشتی کے عظیم پیامبر اور مذہب و اخلاق کے بہت بڑے نمونہ و نمائندہ، گاندھی جی کی جان کی نذر لے کر۔ جیسے دلّی والوں کے اس دیرینہ توہم کی تصدیق ہو گئی ہو کہ جب تک وبا یا ابتلائے عام کسی بڑے آدمی کی جان نہیں لے لیتا، فرو نہیں ہوتی۔

بے بسی، بے قراری اور خطرے کے ان دنوں میں ذاکر صاحب نے جس اعتماد و عزم اور جس خلوص و خاموشی سے بگڑی اور بگڑتی ہوئی صورتِ حال کا مقابلہ کیا اور جس طرح تباہ حال مسلمانوں کو تسکین دینے اور حوصلہ دلانے میں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کیں، اس کا اعتراف سب نے کیا۔ یہ عمل اگر ایک طرف ان کے سچے اور پکے مسلمان ہونے پر دلالت کرتا ہے، تو دوسری طرف ان کے سچے اور پکے وطن دوست ہونے کی بھی دلیل ہے۔ ذاکر صاحب شب و روز

مصروف رہتے۔ جامعہ کے کاموں کے علاوہ طرح طرح کی دوسری ذمہ داریوں سے سابقہ ہوا۔ دلّی کی مظلوم انسانیت کے تقاضے ان کی مسلسل توجہ چاہتے تھے۔ قومی حکومت کے تعلیمی مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے سلسلے میں تمام متعلق کمیٹیوں اور کونسلوں میں شرکت کرنا لازمی سا ہو گیا تھا۔ یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن کے رکن تھے جو حصولِ آزادی کے بعد تعلیم کے مسائل پر مفصّل رپورٹ پیش کرنے کے لیے مامور کیا گیا تھا۔ آزادی کے بعد کے کچھ دن انہی مصروفیتوں کی نذر ہو گئے۔ نومبر ۱۹۴۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ نے باتفاق آرا ذاکر صاحب کو وائس چانسلر منتخب کیا۔

علی گڑھ پر بڑا سخت وقت گزر رہا تھا، جیسے کسی لرزہ خیز زلزلے کی زد میں ہو۔ پورے ملک میں اس وقت ذاکر صاحب کے علاوہ کوئی دوسرا نہ تھا جو اس عظیم علمی، تاریخی اور تہذیبی ادارے کو بچانے اور بحال کرنے کی بیکران اور بے امان ذمّہ داری قبول کرنے کا اہل ہوتا یا اس کی ہمت کرتا۔ آزادی سے چند سال پہلے ہندوستانی سیاست نے جو رنگ و رخ اختیار کیا تھا، اس سے علی گڑھ شدید طور سے متاثر ہوا تھا۔ اس لیے تقسیم ملک کے بعد پورے ملک میں تعصب و تخریب کے جو عناصر ابھرے، علی گڑھ ان کا خاص نشانہ بنا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس لیے اور کہ کسی کے بوتے کا نہ تھا کہ جو صورتِ حال رونما تھی اور تیزی سے بگڑتی جا رہی تھی، اس میں کیا کرے، کہاں جائے، کیا ہوگا اور کس سے رجوع کرے۔ علی گڑھ کے چھوٹے بڑے سب دم بخود تھے۔ جو نہ ہونا چاہیئے تھا، اس کا ان کو احساس تھا؛ جو کچھ ہوا تھا، اس کی ذمّہ داری قبول کرنے کو تیار تھے۔ دوسرے جو چاہتے تھے، اس سے بھی برے بھلے واقف تھے۔ جو نئی ذمّہ داریاں عائد ہوتی تھیں، ان سے بھی خاطر خواہ عہدہ برآ ہونے پر آمادہ تھے،

لیکن یہ سب کیسے ہوتا اور کون کرتا، یہ وہ نہیں جانتے تھے۔

ستّر پچھتّر سال کی طویل مدّت میں اس ادارے نے جو اچھے اور بڑے کام کیے تھے، ان کو محض ایک سیاسی حادثے کی بنا پر نظر انداز کر دیا جائے، نہ مقتضائے انصاف تھا نہ قرینِ دانش مندی۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات نے ملک کو اس طرح زیر و زبر کر دیا تھا کہ شاید ہی کوئی ادارہ، جماعت یا جگہ یا کس و ناکس اس سے متاثر ہونے سے محفوظ رہا ہو۔ علی گڑھ کے لیے جتنی غلط بات یہ تھی کہ وہ ایک اعلیٰ تعلیمی ادارے کے منصب کو نظر انداز کر کے سیاست کے شور و فتن میں داخل ہوا، اس سے بھی زیادہ غلط بات یہ تھی کہ اس کے بدلے اس کے مٹا دینے کو عملِ نیک قرار دیا جاتا۔ اگر آزادی کے معنی ہندوستان میں ایک نئی انصاف پسند اور جمہوری ریاست کا قائم کرنا تھا، تو اس ریاست کے قیام اور کامیابی کی اولین شرط یہ تھی کہ ماضی کے ناخوشگوار واقعات اور حالات کے مہلک سائے اور اس کے اثرات سے مستقبل کو محفوظ کیا جائے۔ ذاکر صاحب نے اس وقت علی گڑھ کی قیادت کی ذمّہ داری قبول کر کے اس بات کو واضح طور پر ثابت کر دیا کہ نئی ہندوستانی ریاست کا بنیادی مقصد ایک مہذّب، ترقی پسند اور ایک انصاف دوست معاشرے کو قائم کرنا ہے، اور علی گڑھ کی بقا اور توسیع کا کام اس مقصد کے حصول میں ایک مؤثر اور مبارک وسیلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ذاکر صاحب کا یہ کوئی نیا خیال نہ تھا۔ ان کی پوری زندگی اس مقصد کی نہایت مستند، روشن اور دلکش تصویر و تعبیر رہی ہے۔

ذاکر صاحب علی گڑھ آ گئے۔ لسان الغیب نے بشارت دی: "یوسفِ گم گشتہ باز آید بکنعان، غم مخور" عندلیبِ باغِ حجاز کی دعا پہنچی: "کلی کلی بتو بری گرمیِ نوا سے گداز" اور محسوس ہونے لگا جیسے ہم سب پھر ایک بار اپنی اس کھوئی

ہوئی فردوس میں آباد ہیں، جس کو اقبال نے آغوشِ مادر کہہ کر کھوئی ہوئی فردوس سے بھی زیادہ دلکش بنا دیا تھا۔ یہ آنا علی گڑھ اور ذاکر صاحب کے درمیان ایک دیرینہ پیمانِ وفا کی تجدید، ایک نئی زندگی کا طلوع اور ایک نئے چیلنج کو قبول کرنے کا عزم و اعلان تھا۔ شکستہ بال، دل گرفتہ اور پابستہ مرغانِ چمن فرطِ مسرت سے زمزمہ سنج ہو گئے۔

سلامٌ علیٰ نجد وھل من نجد!

ذاکر صاحب کی موجودگی، ان کے کام کرنے اور کام لینے کا انداز دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک حد تک سرسیّد کا عہد واپس آگیا ہو اور تباہی اور مایوسی کے ریگزار میں تخلیق و تعمیر کے جا بجا نخلستان ابھرنے اور لہلہانے لگے ہوں۔ ذاکر صاحب مدتوں سے یونیورسٹی کی اگزیکٹو کونسل، اکیڈمک کونسل اور شعبۂ اقتصادیات کے ممبر رہے تھے۔ یوں بھی وہ یونیورسٹی اور اراکینِ اسٹاف سے ذاتی طور پر متعارف تھے، بلکہ یہ کہنا بھی حقیقت سے دور نہ ہوگا کہ ذاکر صاحب جب یہاں کے طالب علم تھے، اس زمانے سے آج تک جب کہ وہ جمہوریہ ہند کے صدر ہیں، ان کی اعلیٰ سیرت و شخصیت، علم و فن سے شیفتگی، عوام و خواص دونوں میں احترام و محبّت کی نظر سے دیکھے جانے اور طالب علموں سے ہمدردی رکھنے کا چرچا جتنا علی گڑھ میں رہا اور اب تک ہے شاید ہی کسی اور کا کبھی رہا ہو۔ ان کے ذہن میں یونیورسٹی کے آئندہ نشیب و فراز کے سارے پیچ و خم کا نقشہ تھا۔ اس لیے ادارے کے انتظام و انصرام میں جو ان کے لیے اتنا ادارہ نہیں جتنا گہوارہ تھا، کوئی دقّت پیش نہ آئی۔ ہر کام دیکھتے دیکھتے اس خوش اسلوبی سے انجام پانے لگا جیسے خوش اسلوبی سے انجام پانا ان کاموں کا خاصہ ہو۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ مواعظِ حسنہ اور سب و شتم کے ان خطباتِ افتتاحیہ سے ہم محفوظ ہو گئے جو ہر کس و ناکس

اختیار کے نشہ یا اقتدار کی جستجو میں علی گڑھ آتا اور یہاں کی تواضع و تکریم سے آسودہ ہو کر ہم کو سنا جاتا۔ ذاکر صاحب کے آجانے سے درد و درماندگی اور خوف و خواری کے وہ دن ختم ہوئے اور ہم کو اس ناقابلِ بیان و برداشت کلفت و کوفت سے نجات ملی۔ اس زمانے اور ان حالات میں یہ کارنامہ کسی اور کے بس کا نہ تھا۔ پھر انہی آنکھوں نے دیکھا کہ بڑے سے بڑا شخص خواہ وہ اپنے عہد کا کیسا ہی علامہ یا عالی جاہ کیوں نہ ہوتا، علی گڑھ آکر ہم کو خطاب کرنے کی جراءت کرتا تو سب سے پہلے ذاکر صاحب کی خدمت میں ہدیۂ عقیدت پیش کرتا اور جو کچھ کہنا اور جس طرح کہنا، انداز وہی ہوتا جیسے استاد کے سامنے اس کی اجازت لے کر پورے آداب و اکرام کے ساتھ سعادت مند شاگرد مشاعرے میں اپنا کلام سناتے ہیں

ذاکر صاحب کے طریقۂ کار کا بڑا دل آویز پہلو یہ ہے کہ انہوں نے کام کرنے یا کام لینے میں منصب کو بطور قوت یا سیاست کبھی نہیں استعمال کیا۔ ان کو جتنا بھروسہ اپنی خیر اندیشی اور دوسروں کی اچھائی پر ہے، اتنا منصب پر نہیں۔ جیتنے کا اس سے بڑا حربہ اب تک دریافت نہیں ہو سکا ہے، لیکن اس حربے کا استعمال آسان نہیں۔ ذرا غفلت ہوئی اور آدمی خود اس کا شکار ہو گیا۔ علی گڑھ میں ذاکر صاحب محض وائس چانسلر نہ تھے جو بندھے ٹکے دفتری یا انتظامی طور طریقوں سے کام لینے اور کرنے کو سب کچھ جانتے ہوں، ان کی وائس چانسلری ایک عالی صفات شخص کی قیادت تھی، جس پر نہ صرف علی گڑھ کو بلکہ اس کے باہر بھی ہر چھوٹے بڑے کو اعتماد و افتخار تھا۔ اس طور پر ذاکر صاحب کے عہد میں علی گڑھ نئے ہندوستان میں اعلیٰ علمی، تعلیمی و تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ علی گڑھ کا شروع سے یہی رول بھی رہا ہے۔ اپنے حسنِ عمل سے جب تک وہ اس کو ادا کرتا رہے گا، اس کی افادیت و اہمیت مسلّم رہے گی۔

اور یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی۔ اس طرح کے ادارے صرف اپنے اعلیٰ بنیادی مقاصد کی توسیع، ترقی و تکمیل میں زندہ و نفع بخش رہتے ہیں۔ ان کو مصالح و مقاصد کے تابع کرنا ایسا ہی ہے جیسے تازہ اور صحت بخش ہوا اور پانی کو مسموم و متعفن کرنا اور رکھنا۔

انگریزی اساتذہ کے عہد (ام اے او کالج) میں تفریحی ورزشی کھیلوں اور ان کی صحیح اسپرٹ SPORTSMANSHIP کو تعلیم و تربیت اور معلومات زندگی کا جس طرح اور جس حد تک جز بنا دیا گیا تھا، جس کے سبب سے علی گڑھ کے عام طلبہ دوسروں سے نمایاں طور پر ممتاز تھے، اس کو ذاکر صاحب نے بڑے شوق، اصرار و اہتمام سے از سر نو نافذ کیا۔ ذاکر صاحب کی طالب علمی کے زمانے میں ام اے او کالج نے کھیلوں میں جو ناموری و نیکنامی حاصل کی تھی، وہ صرف کھیل کے میدان تک محدود نہ تھی، بلکہ یہاں کے طلبہ اور کالج کے جملہ متعلقین و متوسلین کی روزانہ کی زندگی میں نظر آتی تھی۔ اس کا سبب یہ نہ تھا کہ علی گڑھ کے طلبہ آسمان سے نازل یا روس اور امریکہ سے آیا کرتے تھے، بلکہ ان میں اسپورٹس کی روح اس درجہ سرایت کر چکی ہوتی تھی کہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے قطع نظر خود کھیل کے فن میں ان کو غیر معمولی مہارت حاصل ہو جاتی تھی۔ آج بھی جب کہ حالات سازگار نہیں ہیں، علی گڑھ کے طلبہ میں 'اسپورٹس مین شپ' کی روایت تابندہ ہے اور یہ واضح علامت اس کی ہے کہ اس کی سرشت صالح ہے اور وہ ان روایاتِ عظیمہ، اور اقدار عالیہ کا احترام کرتے ہیں جس کا ایک نام علی گڑھ بھی ہے۔

آج کل طرح طرح کے کھیلوں کو جو ترقی دی جا رہی ہے اور ان پر جو کثیر رقم صرف کی جاتی ہے، کسے نہیں معلوم، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ ان کھیلوں سے

'اسپورٹس مین شپ' نہ صرف معدوم ہو چکی ہے، بلکہ ناسمجھی سے اس کو ایسے ہاتھوں میں دے دیا گیا ہے، جو اسپورٹ کو عبادت اور ذمہ داری نہیں، ہمیشہ قرار دیتے ہیں۔ اور ہمیشہ بھی ادنیٰ درجہ کا جیسے اسپورٹس کا مقصد ذہن و اخلاق کی شائستگی نہیں، لاٹھی چارج ہو۔ اسپورٹس بازاروں میں نہیں پنپتے، ان کی نشو نما اخلاق کے مانند، اچھی تعلیم گاہوں میں، اساتذہ کی نگرانی اور تہذیبی روایات کے سائے میں ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ذاکر صاحب نے ایک موقع پر علی گڑھ کے کھلاڑیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "عزیزو! یہ بات اچھی نہیں ہے کہ کھیلوں کے میدان، بالخصوص علی گڑھ میں، تمہارے اچھے کھیلنے پر تمہارے ساتھی تمہاری تحسین کریں۔ اور فریقِ مخالف کے اچھے کھیل پر خاموش رہیں یا اس کی کسی معذوری یا نارسائی پر اس کا مضحکہ اڑائیں۔ یہ کھیل اور شائستگی دونوں کے آداب کے خلاف ہے۔ اگر تم دیکھو کہ ایسا ہو رہا ہے، تو کھیل بند کر دو اور اس پر اصرار کرو کہ جب تک مقابل ٹیم کے کھلاڑیوں کے کھیل کی خاطر خواہ داد نہ دی جائے گی، تم کھیلنا ملتوی رکھو گے۔" ذاکر صاحب جانتے تھے کہ نئے ہندوستان کا جو نقشہ بنے گا اور اس کو جن نئے احوال سے سابقہ پڑے گا، اس میں صحیح و صالح خطوط پر نوجوانوں کی تنظیم کا مسئلہ سب سے اہم ہوگا۔ اس لیے وہ طلبہ میں زیادہ سے زیادہ 'اسپورٹس مین شپ' پیدا کرنے کے لیے خواہاں اور کوشاں تھے؛ اور ان کا خیال صحیح تھا۔ آج کے نوجوان میں ڈسپلن کے فقدان سے جو خطرہ ہے، وہ تمام دوسرے خطروں سے زیادہ ہے۔ سیاسی ناخداؤں کو کوئی سمجھائے کہ جب تک جمہور انام میں صحیح سیاسی و جمہوری شعور نہ پیدا ہو جائے، نوجوانوں کی تنظیم سیاسی مقاصد و مصالح کی سطح پر نہیں، اسپورٹس اور اخلاق کی سطح پر کرنا چاہیے؛ لیکن خود غرضی اور تنگ نظری اس کی مہلت یا اجازت نہیں

دیتی، تو نوجوانوں کی موجودہ بے راہ روی کا ماتم کرنا صرف فعلِ عبث ہے۔

ذاکر صاحب کی وائس چانسلری کا زمانہ کم و بیش آٹھ سال رہا۔ اس عرصے میں کتنے بڑے ادارے میں کتنے بڑے کام انجام پا گئے، ان کا احاطہ کرنا آسان نہیں۔ طلبہ کی اعلیٰ ذہنی و اخلاقی تربیت و نشو و نما کے لیے نئے مواقع اور نئی سہولتیں فراہم کی گئیں۔ درس و تدریس کا کام زیادہ دلسوزی اور یکسوئی سے ہونے لگا۔ لیبورٹریوں کے لیے ضروری اور جدید آلات و سامان فراہم کیے گئے۔ اساتذہ کی بڑی تعداد کو تعلیمی رخصت دے کر باہر بھیجا گیا، تاکہ وہ اپنے مضامین میں مزید لیاقت حاصل کر سکیں۔ سنجیدہ تصنیف و تالیف اور توسیعی خطبات کا بڑے پیمانے پر انتظام ہوا۔ طلبہ کی اقامتی زندگی اور سرگرمیوں کو زیادہ با مقصد، دلچسپ اور راحت رساں بنانے پر خاص طور سے زور دیا گیا۔ حفظانِ صحت کی تدابیر کو وسیع پیمانے پر نافذ کیا گیا۔ خوبصورت کارآمد اور ضروری عمارات تیار ہوئیں۔ یونیورسٹی کے خطے کو صحت بخش اور دلکشا بنانے کے لیے وسیع پیمانے پر چمن بندی کی گئی اور باغات لگائے گئے۔ افتادہ زمینوں میں کاشتکاری شروع کی گئی۔ باہر کی علمی دنیا سے بہتر روابط قائم کیے گئے۔ انہوں نے دینیات و اسلامیات کے نصاب پر مستند علماء سے نظرِ ثانی کرائی اور اس کی خاطر خواہ تعلیم کا بندوبست کیا۔ قومی ورثے کی نگہداشت کے پیشِ نظر ایک مربوط اور فکر انگیز نصاب تیار کرایا اور اس کو نافذ کیا گیا۔ اسلامی علوم کے مطالعے اور تحقیق کے لیے ادارۂ علومِ اسلامیہ قائم کیا۔ شعبۂ تاریخ میں ازمنۂ وسطیٰ کی تحقیق و تدوین کے لیے ایک مستقل شعبۂ تصنیف و تالیف کھولا۔ قومی زبان کی توسیع و ترقی کے لیے بی اے اور بی ایس سی کی سطح پر لازمی اردو اور ہندی کا مناسب و معتبر نصاب رائج کیا۔ نوجوان طالب علموں کی بہتر مجلسی تربیت کے لیے ان کی انجمنِ اتحاد

(یونیورسٹی یونین) کے قواعد وضوابط میں ایسی اصلاحات اور اضافے کیے گئے جن سے اس کا کیرکٹر زیادہ سے زیادہ جمہوری اور نمائندہ ہو گیا اس کی خیابان بندی اس طور پر کرائی گئی کہ طلبہ اطمینان اور یکسوئی سے مطالعہ کریں یا گلگشت سے لطف اندوز ہوں۔ علی گڑھ تاریخ ادبِ اردو کی اسکیم منظور کرائی۔ خواتین کے کالج کے اخراجات کی پوری ذمہ داری اور کفالت یونیورسٹی سے منظور کرائی۔ یہ کالج علی گڑھ کے نامور فرزند شیخ عبداللہ مرحوم کی مجاہدانہ کوشش سے عرصے سے قائم ہے، مسلم یونیورسٹی سے ملحق تھا، لیکن محدود مالی وسائل کے سبب سے اپنے توسیعی پروگرام کو پورا کرنے سے معذور تھا۔ بورڈنگ ہاؤس اور ان کے کامن روم کی سرگرمیوں کو زیادہ باقاعدہ بنایا۔ انجینئرنگ کالج، پالی ٹیکنک اور ان کی کارگاہوں (ورکشاپ) کے کاموں کو ترقی دی اور ان میں طلبہ کے داخلے کی تعداد میں اضافہ کیا۔ یونیورسٹی ہسپتال اور ہیلتھ سروس کے کاموں کو وسیع تر اور منظم تر کیا اور لائق طبی عملہ فراہم کیا، جن سے بحیثیت مجموعی طبی سہولتوں میں قابلِ قدر اضافہ ہوا۔ طبیہ کالج کے نصاب میں مفید اور دور رس تبدیلیاں کی گئیں اور اس کے انتظام و انصرام کو زیادہ وسیع اور مستحکم بنیادوں پر قائم کیا گیا۔ مجوزہ میڈیکل کالج کے قیام کی اسکیم کے لیے حکومت کی باقاعدہ منظوری اور اعانت حاصل کی۔ امراضِ چشم کی مخصوص تعلیم اور تحقیقات کے لیے انسٹی ٹیوٹ کھولا۔ یونیورسٹی کی املاک اور اراضی کا باضابطہ ریکارڈ تیار کرایا اور ان میں اضافے کیے۔ لائق اساتذہ، طالب علموں اور اہل علم کی نہ صرف ذاتی طور پر ہمت افزائی کی، بلکہ ان کے کاموں کے لیے کثیر رقمیں حکومت کے علاوہ دوسرے ذرائع سے فراہم کیں۔ ذاتی اثر و اعتبار سے جتنے کثیر عطیات حاصل کیے، اس سے پہلے اتنے مختصر عرصے اور کلیتہً بدلے ہوئے حالات میں شاید ہی

کبھی جمع کیے گئے ہوں کیمپس کی موجودہ اور آئندہ ضرورتوں کے پیشِ نظر تفصیلی منصوبہ مرتب کیا گیا، جس کا بڑا حصہ ذاکر صاحب کے عہد میں نافذ ہوا اور بقیہ بعد میں پورا کیا گیا۔ لائبریری، آرٹس فیکلٹی، جیالوجی اور فزکس کے نئے معمل، پالی ٹیکنک اور انجینیرنگ کالج میں بڑے پیمانے پر ترمیم و توسیع، یونیورسٹی ہسپتال کی عمارت میں اضافہ اور ضروری ردّ و بدل، یونین کی عمارت کی توسیع وغیرہ جن کی تکمیل بعد میں ہوتی رہی، ان کا نقشہ اور ان کی تعمیر کے لیے ضروری رقم کی منظوری، یہ سب ذاکر صاحب کے عہد میں ہی طے پا چکے تھے۔

یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہونے کے علاوہ ذاکر صاحب انجمن ترقی اردو اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بھی صدر تھے۔ انجمن کا دفتر انہی کے ایما سے علی گڑھ منتقل ہوا۔ ان کی رہنمائی میں اس کی نئی تنظیم عمل میں آئی، مالی حیثیت سے مستحکم ہوئی اور اس کے کاموں کا آغاز ہوا۔ کانفرنس ایک مضمحل ادارہ بن کر رہ گئی تھی۔ ذاکر صاحب نے اس کو سہارا دیا اور فعّال و کارآمد بنایا۔ نابینا اسکول کو سرپرستی میں لے کر اس کی بنیادوں کو مضبوط اور اس کے مقاصد کو بار آور کیا۔ ہونہار اور ضرورت مند طالب علموں کی امداد اور ہمّت افزائی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ سرسیّد ڈے ایک عرصے سے رسمی روایتی انداز سے منایا جاتا تھا، ذاکر صاحب نے اس کو اس طرح منانے کی طرح ڈالی جو نہ صرف اس دن کی اہمیت کو واضح اور دل نشین کرے، بلکہ علی گڑھ کے فرزندوں میں اس کے ذریعے شعورِ ذات اور انفرادی و اجتماعی ذمّہ داریوں کا احساس پیدا کرے۔ یونیورسٹی کی تاریخی عمارتوں اور ان کے کمروں کو ادارے کی شایانِ شان نہایت نفاست سے مزیّن کرایا۔

غرض اتنا کچھ ہوا کہ ملک میں علی گڑھ کو نہ صرف ایک مثالی تعلیم گاہ کا

درجہ حاصل ہوا، بلکہ وہ ایک ایسی تہذیب و شائستگی کا ترجمان بن گیا۔ جو اصلاً اسلامی تھی، مگر اس کے ساتھ ہی دوسری تمام تہذیبوں کی اعلیٰ روایات و اقدار کو انسانیت کا ناقابلِ تقسیم ورثہ تسلیم کرتے ہوئے، ہندوستان کی تعمیرِ نو میں ایک اہم اور بیش بہا کردار ادا کرنے کی طاقت رکھتی تھی۔ اس طور پر مستقبل میں علی گڑھ ایک ہم آہنگ وسیع المشرب اور مہذّب قومی زندگی کے فروغ و استحکام کی علامت و بشارت بن گیا۔ یہ خوش آیند تبدیلی سب کی متفقہ کوششوں کا نتیجہ تھی، لیکن اس کے محرک اور روحِ رواں ذاکر صاحب تھے

علی گڑھ تحریک کا سب سے بڑا مقصد ہندی مسلمانوں کی اعلیٰ ذہنی و اخلاقی تربیت کے لیے ایسے مواقع فراہم کرنے تھے جو ایک طرف ان کو قومی زندگی میں ایک فعال اور ترقی پذیر جماعت کی حیثیت دلانے میں معیّن ہوں اور دوسری طرف ملک میں اسلامی تہذیب کی بامعنی اور تخلیقی نشو و نما میں مدد دیں۔ اس طور پر ایک بوقلموں متوازن ہندوستانی تمدن کے صحت مند، ہم آہنگ اور بابرکت ارتقا کے فروغ کا باعث ہوں۔ یہ ادارہ نوجوان نسلوں کی کیسی تربیت کرنا چاہتا تھا اور ان سے کیا توقعات رکھتا تھا، اس کی وضاحت اس ایڈریس میں ملے گی جو اس کی تاسیس کے موقع پر دیا گیا تھا، جس کا اقتباس یہ ہے:

"....., THAT THIS COLLEGE MAY EXPAND INTO A UNIVERSITY WHOSE SONS SHALL GO FORTH THROUGHOUT THE LENGTH AND BREADTH OF THE LAND TO SPREAD THE GOSPEL OF FREE ENQUIRY, OF LARGE HEARTED TOLERATION

AND OF PURE MORALITY."

ذاکر صاحب کی وائس چانسلری کا عہد علی گڑھ تحریک کے اس بنیادی نصب العین کی پیروی و پابندی کا رہا۔

ذاکر صاحب کا نہایت درجہ قابل ذکر اور تاریخی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے شدید تباہی اور یکسر مسماری کے ماحول میں تخلیق و تعمیر کے کاموں کا آغاز کیا۔ ان کا یہ عمل اس حدیث شریف کے مطابق تھا، جس میں آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ اگر مجھ کو یقین ہو کہ کل قیامت آنے والی ہے، تب بھی میں آج کھجور کا ایک نیا پودا زمین میں نصب کروں گا اس قولِ پاک میں انسانیت کے تعمیری و تخلیقی تربیت کے لیے کتنی بشارتیں ملتی ہیں! اس وقت ذاکر صاحب کے اس عمل سے مایوس و ملول دلوں کو کیسی اور کتنی تسکین و تقویت نصیب ہوئی، اس کا تصور آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے بے غرض خدمت کا تصوّر عام کیا اور یہ بتایا کہ بے لوث خدمت بالآخر تخریبی عناصر سے غالب آتی ہے۔ انہوں نے اچھے اور بڑے کام کو خود اپنا انعام جاننے اور ماننے پر زور دیا اور اسے عزتِ نفس اور اطمینانِ نفس حاصل کرنے کا وسیلہ بتایا، تعصب تنگ نظری کے مقابلے میں شرافت اور انسانیت پر قائم رہنے کا درس دیا، جہالت اور گمراہی کا سب سے مؤثر علاج تعلیم و تہذیب سے کرنا سکھایا، مہذّب اور ایماندار رہنے کے لیے کوئی قیمت وصول کرنے کے بجائے قیمت ادا کرنے کی اہمیت جتائی، مایوسی کے اندھیرے میں امید اور حوصلے کے دیے کو روشن رکھنے کی ذمہ داری کا احساس دلایا، ہندی مسلمانوں کو ہندوستانی انسانیت کا جزو لاینفک جان کر ان کی خدمت کو ہندوستان کی خدمت اور خیر اندیشی قرار دیا، اور ان پر ہندوستانی ریاست کی تمام ذمہ داریوں

کو اپنانے کی ضرورت کو واضح کیا، علی گڑھ کو قوم کی امانت جان کر اس کو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے اس کی افادیت اور اہمیت کو ظاہر کیا اس طور پر ہندوستان کی غیر مذہبی جمہوریت کی لاج رکھی۔ ذاکر صاحب کی وائس چانسلری کے یہ آٹھ سال علی گڑھ اور ملک دونوں کبھی نہ بھلا سکیں گے۔

ستمبر ۱۹۵۶ء میں جب وائس چانسلر کی معیار کے پورے ہونے میں تقریباً سوا سال باقی تھا، ذاکر صاحب نے علی گڑھ چھوڑنے کا فیصلہ کیا، جو انتہائی غیر متوقع تھا۔ سب نے اسے شدت سے محسوس کیا اور کوشش کی کہ وہ اپنا فیصلہ بدل دیں، لیکن وہ کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے۔ یہ فیصلہ انہوں نے کن اسباب پر کیا، اس کی وضاحت نہ انہوں نے کی، نہ دوسروں کو دریافت کرنے کی جرأت ہوئی۔ قیاس آرائی بہت ہوئی، لیکن بیشتر غلط تھی۔ ذاکر صاحب اجتماعی ذمہ داری کا بڑا گہرا احساس رکھتے ہیں۔ ان کی پوری زندگی اس پر گواہ ہے کہ انہوں نے ذاتی خواہش اور نفع کو اجتماعی مفاد و مقاصد پر کبھی ترجیح نہیں دی۔ اس لیے اس بات کا یقین رکھنا چاہیے کہ انہوں نے علی گڑھ چھوڑا ہوگا تو ان کے نزدیک یہ فیصلہ ان کی ذات کے لیے نہیں، بلکہ ادارے کے مفاد میں تھا۔ ذاکر صاحب نے کالج چھوڑا، تو جامعہ کو سنبھالا۔ پھر وقت آیا، تو جامعہ کو چھوڑ کر علی گڑھ کی ذمہ داری قبول کی۔ علی گڑھ سے جانے کے بعد قومی حکومت کی رکنیت اختیار کی۔ قومی خدمت کا مطالبہ جب کبھی اور جہاں کہیں سے ہوا، ذاکر صاحب نے قبول کیا۔ ہر ایسے کام کو فرض جانا اور اس کو اس طرح سرانجام دیا کہ اس کام کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا۔ لیکن جب کبھی یہ محسوس کیا کہ وہ مفوضہ فرائض کے مطالبات کو اس طرح پورا نہیں کر سکتے۔ جس کا وہ متقاضی تھا، تو اس سے دست بردار ہو گئے۔

ذاکر صاحب طبعاً ہر شخص کو اپنا سمجھتے ہیں، یا اس میں اچھا بننے کی صلاحیت دیکھتے ہیں، یا اس کو اچھا بنا لینے کی اپنے میں صلاحیت پاتے ہیں۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ اصول جتنا اعلیٰ و ارفع ہے، سیاست یا انتظامی مصالح کے اعتبار سے اتنا ہی ناقابلِ عمل، مضر یا خطرناک ہو سکتا ہے۔ تاریخ ہی سے نہیں، روزمرہ کے حالات و حوادث میں بھی اس کی تصدیق ملتی ہے۔ کبھی کبھی وہ ایسے کو بھی اچھا سمجھنے لگتے ہیں، جو ناسزا کا مرتکب ہونا، اپنے مسلک کا تقاضا اور اپنا کارنامہ سمجھتا ہے۔ عام طور پر دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ کسی ناسمجھ یا شریف آدمی سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے اور اس کی خبر کسی مفسد کو مل جائے، تو وہ اس راز کو افشا نہ کرنے کے معاوضے میں طرح طرح کے تاوان وصول کرتا ہے اور بدنصیب اپنی شہرت اور ناموس بچانے کی خاطر اپنی ہر متاعِ عزیز قربان کرتا رہتا ہے ذاکر صاحب کے یہاں اس کی نوعیت اور طرح کی ہے۔ وہ اپنی نیکنامی کو محفوظ رکھنے کے لیے نہیں، اس لیے کہ وہ ہمیشہ سے مسلّم اور بے داغ رہی ہے، بلکہ اپنے سکونِ خاطر کو بچانے کے لیے جو ان کو بہت کم میسّر آتا ہے اور جس کے مرتکب یہی اہلِ غرض ہوتے ہیں، ان کے مطالبات پورے کرتے رہتے ہیں، بعینہٖ اس بدنصیب کے مانند جس کا ذکر اوپر آیا ہے۔ مختصر یہ کہ اہلِ غرض ذاکر صاحب سے اپنے سیئات کا انعام پاتے رہتے ہیں۔ اور خود ذاکر صاحب اپنے حسنات کا تاوان ان کو ادا کرتے رہتے ہیں۔ اور جب تک فریقین بفضلہٖ بقیدِ حیات ہیں، یہ کاروبار یونہی چلتا رہے گا۔ کام کرنے اور شاید کام لینے کا ایک اسٹائل یہ بھی ہے، لیکن اکثر دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ یہ فتنہ ایک بار راہ پا جائے، تو کسی نہ کسی طرح اپنا سر ضرور اٹھائے گا۔ پھر وہ سب کچھ ہو جائے گا جو جلد یدیر ایسے میں ہوا کرتا ہے اس میں شک نہیں کہ نالائق یا فتنہ پرداز کو ذاکر صاحب

جتنا جلد پہچان لیتے ہیں، دوسرا شاید نہ پہچان سکتا ہو۔ نیز وہ ان عناصر کو جس طرح قابو میں رکھ سکتے ہیں، دوسرا نہیں رکھ سکتا لیکن منصب کے دوران میں، ورنہ اس سے کنارہ کش ہونے کے بعد وہ عناصر و عوامل جیسا کہ ان کا معمول ہے اپنی پوری تخریبی قوتوں سے ابھرتے ہیں جن کو ذاکر صاحب نے اپنے عہد میں کسی نہ کسی مصلحت کی بنا پر انگیز کیا تھا یا اپنے طور پر قابو میں رکھا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام اقدار اور ادارے، منصوبے، مقاصد اور نیک ارادے جن کی حفاظت اور ترقی کی امانت و عنانت ان کے سپرد کی گئی، ان کی علیحدگی کے بعد ابتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ذاکر صاحب جرائم کی اصلاح کر سکتے ہیں، جرائم پیشہ کا استیصال نہیں کر سکتے۔ اسے اچھے اور بڑے آدمی کی بڑائی بھی کہہ سکتے ہیں، اور اس کی معذوری بھی! بہرحال یہ جام و سندان باختن کا معاملہ ہو یا نہیں اندیشہائے دور دراز کا مسئلہ ضرور ہے۔

ذاکر صاحب میں ایک خاصہ یا خوبی اپنے قبائلی اجداد کی ملتی ہے یعنی صوفیہ، فقرا اور اہل اللہ سے ارادت۔ اس فرق کے ساتھ کہ وہ ان نقوش قدسیہ کے کشف و کرامات پر اتنی نظر نہیں رکھتے، جتنی ان کے پاکیزہ کردار پر اس سے ان کی اخلاقی و ذہنی دروبست میں توانائی اور نظر میں رفعت و رافت آئی ہے۔ معلم و مرشد کا قرآن ذاکر صاحب میں آج سے نہیں، بہت دنوں سے چلا آرہا ہے۔ لیکن اس قرآن کو ہر سطح اور ہر موقع پر ملحوظ رکھنا کبھی کبھی فتنے اور فتور کا بھی باعث ہو سکتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہو کر اوج طور سے اپنے ساتھیوں میں واپس تشریف لائے، تو سامری کی فتنہ پرداری اور گئو سالہ کی گرم گفتاری پر بے قرار ہو گئے اور حضرت ہارون پر، جن کے سپرد کیمپ کا ڈسپلن کر گئے تھے،

پیش دستی کر بیٹھے، رسالت پر سرفراز ہونے سے پہلے بھی ایک قبطی کو بنی اسرائیل پر ظلم کرتے دیکھ کر حضرت نے ایک گھونسے سے اس کا کام تمام کر دیا تھا۔ پیغمبروں میں یہ روایت صرف حضرت موسیٰ کے حصے میں آئی۔ اس پر کسی ستم ظریف نے یہ کہا ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار میں صرف ایک پیغمبر پٹھان تھے، یعنی حضرت موسیٰ۔ ذاکر صاحب کے سامنے قائم گنج کے ہموطنوں کی اس طرح کی کتنی روایات تھیں، لیکن انہوں نے اپنے وطن، اپنے سرحدی قبائلی اجداد، اور حضرت موسیٰ کی روایات نیز اقبال کے مشہور مقولہ "عصا نہ ہو، تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد" کو نظر انداز کر کے حضرت مسیح کے مصلوب ہو جانے کی روایت کو کس طرح ترجیح دی، تعجب سے خالی نہیں۔

ایک بات ذہن میں اکثر آتی ہے۔ وہ یہ کہ داستان کوئی لکھے، ڈراما میرا دیکھا ہوا ہے، اور مولانا محمد علی کا فقرہ یاد ہے، جو کچھ اس طرح کا تھا: جامعہ ملیہ کا قائم کرنا اور فروغ دینا اتنا مقصود نہیں ہے، جتنا ام اے او کالج کو قبضے میں لینا اور راہ پر لانا منظور ہے۔ لیکن ذاکر صاحب نے کتنی کڑی قربانی دے کر اور آزمائش میں پڑ کر اس کا نقشہ یکسر بدل دیا اور جامعہ کو بجائے خود ایک مستقل مقصد بنا دیا اور کتنا عظیم الشان مقصد! ان کے عہد میں ان کے غیر معمولی ایثار و اثر سے ہندوستان میں جامعہ ایک نادر الوجود ادارہ تھی، لیکن ذاکر صاحب جامعہ سے علیحدہ ہوئے تو جامعہ بھی شعلۂ مستعجل بن کر رہ گئی۔ علی گڑھ اور جامعہ دونوں کو ذاکر صاحب ملے ایک نے ذاکر صاحب کو پالا پوسا اور پروان چڑھایا، دوسرے کو ذاکر صاحب نے پالا پوسا اور پروان چڑھایا لیکن اگر کسی دیوانے کو یہ کہتے بھی سنا جائے، تو فرزانے کیا کہیں گے کہ علی گڑھ سے ٹوٹ کر جامعہ ملیہ اسلامیہ خانۂ خدا بنی ہو یا نہیں، علی گڑھ آج بھی خانۂ

خلق اللہ ہے۔

ذاکر صاحب دلّی سے علی گڑھ گئے، تو خیال تھا کہ تھوڑے دنوں ان کو آرام سکون ملے گا جس کی ان کو بڑی ضرورت تھی۔ لیکن ہوا یہ کہ وہاں پہنچتے ہی حکومت ہند نے ان کو یونسکو کے اجلاس میں جو اسی سال دلّی میں منعقد ہو رہا تھا، اپنا نمائندہ مقرر کر دیا۔ اس اجلاس میں یونسکو نے ان کو اپنی مجلسِ منتظمہ کا رکن منتخب کیا۔ اور اس سلسلے میں انہیں یوروپ جانا پڑا۔ اس مجلس کے دو دفعوں میں ذاکر صاحب علاج کے لیے جرمنی گئے۔ وہیں وزیرِ اعظم کا پیغام پہنچا کہ بہار کی گورنری پر تقرر کرنا چاہتے ہیں اور وہ ذاکر صاحب کا جواب نفی میں نہ قبول کریں گے۔ جو لوگ ذاکر صاحب کو جانتے ہیں، وہ اس کا احساس آسانی سے کر سکتے ہیں کہ ان کا دل اس عہدے کو آسانی سے قبول کر لینے پر مشکل ہی سے آمادہ ہوا ہوگا، اور اس قسم کی دعوت محض وزیر اعظم کی طرف سے موصول ہوتی تو بہت ممکن ہے، وہ معذرت کی کوئی صورت نکال لیتے لیکن ان کے لیے پنڈت جی کی بات کو ٹالنا ممکن نہ تھا۔ گاندھی جی کے بعد اگر کسی کے منشاء کو پورا کرنے میں ان کو دلی خوشی ہوتی، تو وہ پنڈت جی تھے۔ ذاکر صاحب آمادہ ہو گئے، اور غالباً اپریل ۱۹۵۷ء میں پٹنہ جا کر گورنر کا چارج لے لیا۔ مسلسل پانچ سال تک اس کی ذمہ داریوں سے بطریق احسن عہدہ برآ ہوتے رہے ان کو حکومت اور عوام کا وہ مثالی اعتماد اور تعاون حاصل رہا جسے اہالیان بہار اور حکومتِ ہند مدتوں نہ بھلا سکیں گے۔

گورنر کی آئینی پوزیشن کچھ اس طرح کی ہوتی ہے کہ صرف مخصوص حالت میں صدرِ ہند کے نمائندۂ خاص کی حیثیت سے اسے حکومت کے پورے اختیارات حاصل ہوتے ہیں، ورنہ عام طور پر ریاستی حکومت کا سارا کام وزیرِ اعلیٰ اور

اسی کا نتیجہ انجام دیتی ہے اور گورنر محض ایک مشیر کی حیثیت رکھتا ہے، جس کے مشورے کی پابندی پر ریاستی حکومت بالکل مجبور نہیں ہوتی۔ یہ صرف ذاکر صاحب کے اعلیٰ ذہن اور اخلاقی صفات کا نتیجہ تھا کہ حکومت ان کے مشورے کی طلبگار ہوتی تھی، اور اس پر عمل کرتی۔ اس کے ساتھ لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ راج بھون جو ریاست کی عام زندگی سے الگ تھلگ حکومت کے سب سے بڑے نمائندہ کا ایک سرد اور سنسان مسکن تھا اور صرف سرکاری تقریبات کے موقعوں پر اس بیمار کے منھ پر مضمحل سی رونق آجاتی، ذاکر صاحب کی موجودگی سے ارباب علم و فن، طلبہ، شرفا اور ضرورت مندوں کا ماویٰ اور ملجا بن گیا گورنمنٹ ہاؤس کی تزئین و آرایش میں ذاکر صاحب نے جو دلچسپی لی، اس کا صحت مند اور خوشگوار اثر ہر شخص نے محسوس کیا۔ انہوں نے وہاں کے مقرر قاعدوں اور ضابطوں کی پابندی اس خوش اسلوبی سے کی اور کرائی کہ یہ گرانی طبع کا باعث بننے کے بجائے گوارہ اور پسندیدہ معلوم ہونے لگے۔

ذاکر صاحب موقع اور محل کے مناسب حال عمل پر قدرت رکھتے ہیں ان کی طبیعت میں بیک وقت اثر پذیر اور اثر انداز ہونے کی غیر معمولی صلاحیت ہے، ان کا غیر معمولی رسا ذہن آسانی سے ان اسرار و رموز کو پا لیتا ہے، جو دوسروں کی سمجھ میں مسلسل مشاہدے اور مطالعے سے بھی مشکل آتے ہیں۔ ان کی یہ صفت علم و حکمت کے دقائق اور غوامض ہی کی عقدہ کشائی پر قادر نہیں ہے، بلکہ زندگی میں نت نئے پیش آنے والے پیچیدہ اور نازک مسائل سلجھانے میں بھی کارگر ہوتی ہے۔ بہار میں وہ نہ صرف ایک ہر دلعزیز گورنر تھے، بلکہ ریاست کے ایک محترم بزرگ، دانشوروں اور طالب علموں کے ہمدرد و قدردان اور حکومت کے معتبر مشیر اور عوام کے خیر خواہ تھے۔ اس زمانے میں بہار کے جن لوگوں سے ملنا ہوا،

وہ ذاکر صاحب کی گورنری کو ریاست کے لیے باعثِ امتنان و افتخار سمجھتے تھے۔

۱۹۶۲ء کے انتخابات کے بعد جب نئی مرکزی حکومت بنی، تو ذاکر صاحب کو نائب صدر منتخب کیا گیا۔ ہندوستان کے نائب صدر ہونے کی حیثیت سے انہوں نے جو خدمات انجام دیں، ان سے ملک کا ہر چھوٹا بڑا واقف ہے اور اب پچھلے مئی ۱۹۶۷ء سے وہ صدرِ جمہوریہ کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہیں۔ لیکن حکومت کے ایک عالی مقام عہدے دار ہونا ذاکر صاحب کے لیے اتنا وجیہہ امتیاز نہیں، جتنا یہ کہ ان کی حیثیت ایک اعلیٰ مدبر اور قائد کی ہے، جو ہماری تہذیب کی اعلیٰ اقدار کا حامل و مبلغ، ہندوستانی ریاست کے بنیادی عقائد کا نگہبان؛ انصاف، انسانیت اور شرافت کا پیکر و پیامبر، اور ہندوستان میں عالمگیر انسانیت کے اتحاد و یگانگت کا بے لوث خادم بھی ہے اور اس کا گرانمایہ مخدوم بھی۔ حکومت اور ریاست کا کاروبار جیسا کچھ ہوتا ہے اس سے تھوڑا یا بہت کون نہیں واقف ہے۔ مصلحت کی خاطر کیا کیا نہیں ہوتا اور جو اس کام میں پڑتا ہے، اس کو کیا کچھ کرنا، سننا یا سہنا نہیں ہوتا۔ ذاکر صاحب کے حصے میں یہ سب آیا ہو، تو کیا عجب۔ لیکن ملک کے سنجیدہ طبقے کو اس کا یقین ہے کہ ذاکر صاحب با اصول اور صالح سیاست کے راستے سے کسی حال میں تجاوز نہ کریں گے۔ اور حکومت و ریاست کے کاموں میں ہمیشہ انصاف پسندی اور روشن خیالی سے کام لیں گے۔ ذاکر صاحب کا نہ صرف یہ عقیدہ ہے، بلکہ عمل بھی ہے کہ اعلیٰ مقاصد صرف اعلیٰ وسیلوں سے حاصل ہوتے ہیں اور اعلیٰ مقاصد ادنیٰ وسیلوں کے استعمال کا کبھی جواز نہیں بن سکتے۔ حکومت کے فیصلوں کے خوب و زشت کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں، لیکن ذاکر صاحب اپنا فریضہ پورا کرنے میں حتی الوسع

کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔ اس کا اعتراف ان کے سارے ہم وطن کرتے ہیں خواہ وہ کسی مسلک و مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔

ذاکر صاحب کے لیے نئی اور نادر چیزوں میں بڑی کشش ہے، چاہے وہ چیزیں اتنی مختلف ہوں جتنا گلاب کا پھول یا جیالوجی کا کوئی عجوبہ، نئی چال کی تصویر اور مصوّری ہو یا پرانے زمانے کا کوئی مخطوطہ، "شریعت، تصوّف، کلام" پر کوئی قدیم تصنیف ہو یا مغرب کے جدید ترین ناول اور افسانے یہ "اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں" اظہارِ واقعہ ہے۔ ذاکر صاحب گھر پر ہوں گے تو ان سے چند ہی گز کے فاصلے پر یہ ساری چیزیں اپنی اپنی جگہ رونق افروز ملیں گی۔ کوئی صاحب فن ہو، اس سے گفتگو اس سطح سے کریں گے جو فن اور فنکار دونوں کے حسبِ حال ہو ایسے میں بعض فنکاروں نے کچھ اس طرح بھی محسوس کیا ہے جیسے ذاکر صاحب کے سامنے عرضِ ہنر کرنے میں محتاط رہنا فن سے مقدّم یعنی قرنا نگی ہے۔ ذاکر صاحب کے فکر کی تازہ کاری اور تخیل و ذوق کی رنگا رنگی، ان کی شخصیت اور صلاحیتوں کو کبھی باسی یا دور از کار اور ان کی نفع رسانیوں کو کبھی کم نہ کر سکیں گی، جس طرح فطرت کی تازہ کاری رنگا رنگی اور نفع رسانی میں آج تک نہ کوئی فرق آیا، نہ آئے گا۔ زندگی اسی کا نام ہے جس کے بارے میں اقبال نے کہا ہے "دہر دم جواں ہے زندگی"، یہ صلاحیتیں زیادہ تر فطری ہوتی ہیں، لیکن اس میں اس تربیت کو بڑا دخل ہے جو فرد کو اپنی تاریخ و تہذیب کی اعلیٰ روایات، صحت مند، پُر آزمایش ماحول اور محترم بزرگوں اور ممتاز ساتھیوں سے میسر آتی ہے، ام اے او کالج کی تعلیم و تربیت کے یہی وہ عوامل تھے، جن کے کسر و انکسار میں ذاکر صاحب کی شخصیت بالیدہ ہوئی اور برگ و بار

لائی اور کیسے عجیب اور عظیم عوامل تھے وہ، "گوئی فشردہ اند بجام آفتاب را"
بقولِ غالب۔

علم، مذہب، اخلاق اور انسان دوستی کے پیرو پیکر کبھی اپنی افادیت و
اہمیت نہیں کھوتے، اس لیے کہ وہ اقدارِ عظیمہ کے امین و حامل ہوتے ہیں، وہ
جتنے معمر اور نحیف ہوتے جاتے ہیں، ان کا فیض اور فضیلتیں اتنی ہی زیادہ وسیع
موثر اور محکم ہوتی جاتی ہیں، برخلاف سیاسی لیڈروں یا سرکاری عمال یا عہدہ
داروں کے جو باعتبارِ منصب و عہدہ کتنے ہی اثر و اقتدار کے مالک کیوں نہ ہو جائیں
ان سے سبکدوش یا محروم ہوتے ہی اتنے کس مپرس اور نامراد ہو جاتے ہیں
جیسے وہ اپنے دورِ منزلت کے گناہوں کی سزا بھگت رہے ہوں۔ ایسی عبرتناک
مثالیں ہر شخص ہر روز، ہر جگہ دیکھ سکتا ہے۔ جن اعلیٰ صفات اور خدمات
کی بنا پر ذاکر صاحب نے عام دلوں میں عزت و محبت کی جگہ پیدا کر لی ہے وہ
ہمیشہ ترقی کرتی رہے گی خواہ وہ کسی سیاسی یا ملکی عہدے پر متمکن رہیں یا نہ رہیں
وہ نائب صدر اور صدر کے مناصب پر فائز نہ ہوئے ہوتے، جب بھی ان
کے مرتبے میں کوئی فرق نہ آتا۔ بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ان عہدوں کی سربراہی
ان کو سونپی نہ گئی ہوتی، تو کیا عجب وہ عوام اور خواص میں اور زیادہ مقبول و
محترم ہوتے۔ ذاکر صاحب کی منزلت کا مدار مناصبِ جلیلہ پر نہیں، بلکہ
اخلاقِ فاضلہ پر رہا ہے۔ اور اخلاقِ فاضلہ میں ذوق و ذہانت اور علم و دانش
کا اضافہ ہو جائے، تو شخص اور شخصیت کی گرانمائیگی لازوال ہو جاتی ہے۔

ذاکر صاحب کا مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ بہت وسیع اور متنوع ہے
انہوں نے کثرت سے سفر کیے ہیں۔ ہر سطح پر ہر طرح کے ذہنوں سے گوناگوں
مسائل پر گفت و شنید کے مواقع آئے ہوں گے۔ ان کو افہام و تفہیم سے

ہموار کرنے میں ذاکر صاحب کی کتنی اور کیسی اعلیٰ ذہنی اور اخلاقی صلاحیتیں بر سر کار آئی ہوں گی، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ایسے مواقع پر ان سے بہت قریب یا ان کی زندگی کی سرگزشت سے واقف ہوں گے۔ دوسروں کے نقطۂ نظر کا لحاظ رکھنے میں ذاکر صاحب بڑی انصاف پسندی اور ہمدردی سے کام لیتے ہیں۔ اس اصول یا عقیدہ پر کاربند ہونا آسان نہیں، اس لیے کہ اس میں دوسرے کے حق بجانب ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ سیاست اور ڈپلومیسی کی دنیا میں ایسے حق شناس اور عالی ظرف کم ملیں گے، جو اس خطرے کا سامنا کر سکیں، تنازعے کے تصفیہ کے لیے ایسا فارمولا دریافت کر لینا، جس پر زیادہ سے زیادہ اتفاق اور کم سے کم اختلاف ہو، ذاکر صاحب کا ایسا ہنر ہے، جس میں ان کا ہمسر مشکل سے ملے گا۔

اس کی مثالیں اس زمانے میں دیکھنے میں آئیں، جب وہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ کانفرنسوں، کونسلروں اور کمیٹیوں میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا موقع آیا ہوگا، جب اتفاق آرا کے بجائے کثرت آرا سے تنازعہ فیہ مسئلہ کا تصفیہ ہوا ہو۔ طریق کار بالعموم یہ ہوتا کہ زیر بحث مسئلے پر ہر شخص کو آزادی تھی کہ وہ اپنا نقطۂ نظر نہایت اطمینان اور شرح و بسط سے پیش کرے صدر کی حیثیت سے ذاکر صاحب بھی اس میں حصہ لیتے۔ گفتگو کے بعد ذاکر صاحب اپنی تجویز پیش کرتے، اور وہ ایسی جامع و مانع ہوتی کہ تمام ممبر اس پر متفق ہو جاتے اور یہ محسوس کرتے کہ زیر بحث مسئلے کا بحیثیت مجموعی وہی تصفیہ مناسب حال تھا، جو ذاکر صاحب نے کیا تھا۔ اکثر ایسا معلوم ہوتا جیسے تنازعہ اور اس کا تصفیہ دونوں بیک وقت ان کے سامنے آتے ہوں۔ اس کا سب سے اچھا اثر یہ ہوتا کہ میٹنگ کے بعد کسی ممبر کے ذہن میں اپنے ساتھیوں کے خلاف

کوئی کاوش یا کدورت نہ پیدا ہوتی، نہ باقی رہتی۔ اعلیٰ تعلیم گاہوں میں یہ روایت اور فضا کتنی مفید اور مبارک ہوتی ہے، اس کا اندازہ اس صورتِ حال سے ہو سکتا ہے، جو عام طور پر آج کل چھوٹے بڑے تعلیمی اداروں میں نظر آتی ہے اور ملک کی بھلائی اور بڑائی چاہنے والوں کے لیے پریشانی کا باعث ہے۔ ذاکر صاحب کے عہد میں اور انہی کی رہنمائی میں طلبہ کی مجلسِ اتحاد (یونیورسٹی یونین کلب) کے قواعد و ضوابط میں بڑی وسعتِ نظر سے ایسی اصلاح و اضافے کیے گئے کہ خود طلبہ ان سے زیادہ حقوقِ آزادی کے کبھی طلب گار نہیں ہوئے۔ کہا تو یہاں تک جاتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کی یونین کو جتنے جمہوری حقوق ملے ہوئے ہیں کسی دوسری یونیورسٹی کی یونین کو نصیب نہیں ہیں۔ اسے ذاکر صاحب کا فیض کہیے، یا طلبہ کا احساسِ ذمہ داری و فرض شناسی کہ ان کی وائس چانسلرشپ کے زمانے میں طلبہ نے یونین کے راستے سے کوئی ایسا اقدام نہیں کیا جو ان کے اور اس ادارے کی بہترین توقعات اور روایات کے شایانِ شان نہ ہوتا۔

ذاکر صاحب کے اِرد گرد ہر طرح کی مخلوق مل سکتی ہے، سوائے اس نسل کے جسے عرفِ عام میں مصاحب یا درباری کہتے ہیں۔ پہلے کبھی کسی رئیس اور ریاست کا مرتبہ اس پیمانے سے ناپتے تھے کہ اس پر کتنا قرض ہے اور اس کے گرد کتنے مصاحب ہیں۔ رئیس اور ریاست تو اپنی شامتِ اعمال سے ختم ہو گئے، لیکن ہماری شامتِ اعمال سے ان کے آثار روایات باقی ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ قرض حکومت کے اور مصاحب نیتاؤں کے حصے میں آئے۔ ذاکر صاحب کو اچھے لوگوں میں بیٹھ کر اچھی باتیں کرنے کا بڑا شوق اور سلیقہ ہے، بالخصوص طلبہ، اساتذہ اور اربابِ فن و کمال سے۔ ایسے میں ان کا انداز حاکمانہ

ہوتا ہے نہ مربیانہ، بلکہ نہایت درجہ احترام و دلنوازی کا۔ اپنی شان کے مطابق بات کرنا سب کو آتا ہے۔ بالخصوص جب وہ شان مشتبہ ہو، لیکن دوسروں کے نازک، شریفانہ احساس اور اس کی ذہنی و اخلاقی سطح کو ملحوظ رکھ کر اس طرح گفتگو یا پرسشِ احوال کرنا کہ مخاطب کی تشفی ہو اور اسے اچھے سے اچھے کام کی ترغیب ملے۔ ذاکر صاحب کی سلامتِ طبع، دلسوزی اور دانشمندی کی نمایاں دلیل ہے۔ البتہ وہ اس کو اچھا نہیں سمجھتے کہ آدمی کی جو مخصوص ذمہ داری اور فرائض ہوں، وہ ان سے مختلف، فروتر مسائل پر گفتگو کرے اور اس میں اعانت کا خواستگار، یا داد پانے کا متمنی ہو۔ لیکن اس اچھا سمجھنے یا نہ سمجھنے کی اہمیت اکثر باقی نہیں رہتی، جب گدائے مبرم جن کی بے شمار اقسام ہیں، اپنے مطالبے کو ان سے منوا کر رہتا ہے۔

ذاکر صاحب کا یہ عمل اکثر ایک فارمولے کی بنا پر ہوتا ہے، جس کا قصہ انھوں نے ایک بار بڑے لطف لے کر سنایا تھا۔ ذاکر صاحب جامعہ کے ابتدائی دور میں قرولباغ میں مقیم تھے۔ ان کی اور ان کے رفقا کی زندگی جس "پیغمبری وقت" سے گزر رہی تھی، وہ سب جانتے ہیں۔ ایک دن کوئی مولوی صاحب تشریف لائے اور ذاکر صاحب سے تادیر ان تمام امور پر گفتگو کرتے رہے جن کا ہر غیر مسلم کو مشرف باسلام ہوتے وقت اقرار کرنا اور ایمان لانا پڑتا ہے۔ ذاکر صاحب نے ان مواعظ کو اس احترام و عقیدت سے سنا جیسے اس طرح سننا بھی ایمان کا جزوِ لازم ہو۔ لیکن جب مولوی صاحب نے اس میں ایک عمل کا اضافہ کیا یعنی کچھ روپے مانگے، تو ذاکر صاحب کی سنجیدگی، سراسیمگی میں منتقل ہونے لگی۔ مولوی صاحب نے اسے بھانپ لیا اور بڑی نرمی اور نوازش سے فرمایا "میں جانتا ہوں، زمانہ سازگار نہیں، زندگی

پایدار نہیں۔ مجھے ایسی فرمایش نہیں کرنی چاہیے تھی؛ لیکن اب جب کہ کر چکا، تو اس کو پورا کرنا لازم آتا ہے۔" مولوی صاحب کا مطالبہ کسی نہ کسی طرح پورا کیا گیا۔ یہ فارمولا تفریح بھی ہے، ٹریجڈی بھی؛ اور ذاکر صاحب ہی جانتے ہونگے کہ کب اور کہاں تک یہ تفریح ہے، اور کہاں پہنچ کر یہ ٹریجڈی بن جاتا ہے۔

ذاکر صاحب کی "آب و ہوا" میں مصاحب اور درباری پنپ نہیں سکتے۔ جب تک وہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے، کسی بھلے آدمی کو اس کی شکایت نہ ہوئی کہ ذاکر صاحب کے گرد ایسے مختلف الاوضاع اور اتنے کثیر المقاصد منصوبے کے اشخاص جمع رہتے ہیں یا ایسے مواقع ہوتے ہیں کہ عرضِ حال کا نہ موقع ملتا ہے، نہ اس کی ہمت ہوتی ہے۔ درباری یا مصاحب دور دور تک نظر نہ آتے۔ سبب یہ تھا کہ طالب علم ہوں یا اراکینِ اسٹاف، ذاکر صاحب ان سے جس شفقت و عزت سے پیش آتے، اسی شوق سے یہ بھی دریافت کرتے کہ اس نے مطالعے کے لیے کیا مضامین انتخاب کیے ہیں، کیا پڑھا ہے، اور کس ڈھنگ سے پڑھا ہے فلاں کتاب یا مصنف کے مطالعے کا موقع ملا ہے یا نہیں۔ اسی طرح اراکین اسٹاف سے بھی بعنوانِ شایستہ یہ پوچھتے کہ وہ کیا پڑھاتا ہے، کیا کتابیں، کن مصنفین کی مطالعے میں رہتی ہیں، نصاب کیا ہے، کیا ہونا چاہیے، شعبہ کی ترقی کی کیا اسکیم پیش نظر ہے، کیا مضامین لکھے اور شائع کیے، طلبہ اور شعبے کے رفقائے کار سے کتنا اور کیسا ربط ہے اور اسی طرح کی دوسری باتیں۔ آرٹ ہو یا سائنس، انجینیرنگ ہو یا ڈاکٹری اسپورٹس ہوں یا صحت و صفائی کے منصوبے، امورِ دین ہوں یا مسائل مملکت ان سب پر ذاکر صاحب کی نظر حیرت انگیز حد تک جامع و معتبر ہے۔ اس لیے اصحابِ متعلقہ ان پر تبادلۂ خیال کرنے کے مواقع یا مواخذے

سے حتی الوسع بچنے کی کوشش کرتے، تاوقتیکہ ان کو ان مسائل پر عبور نہ ہوتا اور ان کی خدمات بحیثیتِ مجموعی قابلِ اعتنا نہ ہوتیں، اور یہ وہ مواقع تھے جو درباریوں اور مصاحبوں کے لیے ناسازگار اور ناقابلِ تسخیر تھے۔ پھر بھی یہ یہ اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں کہ زمین کتنی ہی سنگلاخ کیوں نہ ہو شعرائے کرام اشعار نکال ہی لیتے تھے۔

عام طور پر منفی خوبیاں قابلِ لحاظ نہیں ہوتیں مثلاً یہ کہنا کہ فلاں شخص آبرو باختہ، برخود غلط، ابن الوقت، بدباطن، جھوٹا، بدچلن یا ہرزہ سرا نہیں ہے تو یہ اس شخص کی کوئی تعریف نہیں ہے اس لیے کہ یہ عیوب عام طور پر شریف، لکھے پڑھے آدمی میں یوں بھی نہیں ہوتے، نہ ہونے چاہئیں۔ لیکن جب بدحالی، بدنظمی اور بے غیرتی عام ہو اور اخلاقی بندشیں تیزی سے ٹوٹ رہی ہوں، اس وقت سلبی صفات ایجابی خوبیوں کی ہم سطح ہو جاتی ہیں، اس لیے کہ ایجابی صفات تقریباً معدوم ہو چکی ہوتی ہیں۔ ذاکر صاحب کی طالب علمی سے آج تک کی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں، تو کوئی پہلو مجہول یا مبہم نظر نہیں آتا انہوں نے کبھی کوئی بات اضطراراً یا تقریباً ایسی نہیں کی، جو شرافت و شائستگی کے آئین کے خلاف ہو۔ کسی موقع پر اور کسی حال میں کوئی سخیف یا سوقیانہ کلمہ زبان سے نہیں نکالا۔ اپنی کسی برتری کا بھولے سے اظہار نہیں کیا۔ کسی کی ہتک یا دل آزاری نہیں کی۔ مخالفوں ہی سے نہیں، دشمنوں سے بھی تحمل و تواضع سے پیش آئے۔ اپنی بات منوانے کے لیے نہ گلے پر زور دیا نہ زبان کو آلودہ کیا، بلکہ سنجیدگی اور مساوات کی فضا کو ہر طرح سے برقرار رکھا۔ دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھتے ہیں، وہ جس ہمدردی، وسیع النظری اور دانشمندی سے کام لیتے ہیں وہ ان کی اعلیٰ ذہنی و اخلاقی قابلیت کا ثبوت ہے۔ آدمیوں کے

جنگل میں وہ چند ہی ایسے افراد میں ہیں، جو احساسِ کمتری سے مغلوب ہو کر احساس برتری کی نمائش طرح طرح کی خفیف الحرکتی سے نہیں کرتے۔ ذاکر صاحب ہمیشہ اور ہر حال میں، ہر شخص سے خوش ہو کر عزت و محبت سے ملتے ہیں۔ ملنے والے سے کبھی نہ اکتائیں گے۔ کسی بدنصیب کی آبروریزی میں دلچسپی لینا تو درکنار اس خیال کو بھی ذہن میں نہ آنے دیں گے، بلکہ اس کی ہر طرح سے پردہ پوشی کریں گے انہوں نے کبھی احسان نہیں جتایا۔ بظاہر یہ بڑی معمولی بات معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ بڑے ظرف و ضبط کا کام ہے جیسے جذباتِ غضبیہ و شہوانیہ کو قابو میں رکھنا۔ پوشاک ہمیشہ دیسی کپڑے کی سادہ، سجل، ستھری بیشتر سپید پہنی۔ ان کے جسم پر کسی نے کا داک، ملگجا، بوسیدہ یا داغدار لباس نہیں دیکھا۔ مہمان کی تواضع و تکریم میں وہ بددی فیاضی و فخر سے کام لیتے ہیں۔ عزیزوں اور دوستوں کو تحائف دینے اور ان کے لیے پھل اور مٹھائی وغیرہ خریدنے میں روپے کا نہیں، صرف اپنے حوصلے اور عزیزوں اور دوستوں سے محبت اور ان کے احترام کا خیال رکھتے ہیں، اور یہ باتیں اس وقت سے ہیں جب وہ نہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، نہ بہار کے گورنر نہ جمہوریہ ہند کے نائب صدر اور صدر بلکہ صرف ذاکر صاحب تھے اور آمدنی کے وسائل بہت محدود تھے۔

ذاکر صاحب کو تحریر و تقریر پر حیرت انگیز قدرت حاصل ہے، ان کے خطبات، تراجم اور مضامین ہمارے علم و ادب میں قیمتی اور مستقل اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے بچوں کے لیے بھی کہانیاں اور ڈرامے لکھے ہیں، جو شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ذاکر صاحب کا منفرد اسلوب ہے ان کا متوازن متجسس، شائستہ شفاف و شگرف ذہن پاکیزہ، شریفانہ اور نازک

احساس، شگفتہ ادبی ذوق، بیدار و تربیت یافتہ شعور، وسیع اور متنوع مشاہدہ علم اور تجربہ، انسانیت سے عشق اور خدائے واحد پر ایمان، ان کی تحریر و تقریر کو غیر معمولی کشش، قوت، حسن اور تاثیر بخشتے ہیں۔ ذاکر صاحب حتی الوسع تحریر و تقریر سے بچتے ہیں، اس لیے کہ ان کاموں کے لیے جتنا وقت یا فرصت درکار ہوتی ہے، وہ ان کو بہت کم میسر آتی ہے۔ ایسے مشاغل کے لیے وہ اسی وقت آمادہ ہوتے ہیں، جب گریز کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں، چنانچہ یہ کام سخت ذہنی و جذباتی فشار میں انجام پاتا ہے۔ وہ اصلاً تکمیل پسند ہیں، اس لیے خود اپنے کاموں سے بہت کم مطمئن ہوتے ہیں۔ بڑے ذہن کا احساس اکثر یہی ہوتا ہے۔ انہوں نے جو کچھ اور جتنا کچھ لکھ دیا ہے وہ اپنے موضوع پر اجتہاد و استناد کا درجہ رکھتا ہے، سادگی، اعتماد اور جوش جو اچھی ادبی تحریر کی اہم خصوصیات بتائی جاتی ہے، ذاکر صاحب کی تحریر و تقریر میں ان کا بڑا اچھا اظہار و امتزاج ملتا ہے۔ وہ حشو و زوائد سے یکسر پاک ہوتی ہیں اور پڑھنے اور سننے والے کو ہمیشہ ایک نئے خیال انگیز اور قیمتی تجربے سے آشنا کرتی ہیں، جس سے تعمیری و تخلیقی فکر و عمل کی کتنی راہیں کھلتی اور روشن ہوتی ہیں۔ کتنے مختلف النوع مواقع اور مشکل، نازک اور خصوصی موضوعات پر کس کثرت سے ذاکر صاحب کو تقریر کرنی پڑی ہے، لیکن ہمیشہ ایسا معلوم ہوا کہ انہوں نے نئی اور دقیع بات کہی۔ یہ فن اور فیض کم کسی کے نصیب میں آیا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ اب کوہِ ندا کی آواز پردہ کدھر اور کہاں جاتے ہیں۔ سعدیؒ کا دیدہ و دل بہرحال ان کے ہمراہ اور جگر کا یہ شعر زبان پر رہے گا۔

نیتِ شب بخیر اے ساقی
بزمِ جم کیا ہے، ساغرِ جم کیا!

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

ذاکر صاحب کا انتقال ہو گیا۔ کتنی مختصر خبر لیکن کتنا بڑا حادثہ، اُن تمام لوگوں کے لیے جو اچھے شخص اور اچھی باتوں کا احترام کرنا جانتے ہیں۔ تین دن تک مسلسل دہلی میں جو کچھ دیکھنے میں آیا اس سے اندازہ ہوا کہ آج بھی لاتعداد ایسے لوگ ہیں جو اچھے اشخاص اور اچھی باتوں کا احترام کرنا جانتے اور چاہتے ہیں۔ موت اور زیست ہر متنفس کے لیے تقدیر ہے لیکن ان کا شرف کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب کی زندگی اور مرگ دونوں باشرف تھے اس لیے کہ ان کے دونوں ایک دوسرے سے مشرف تھے۔

طبیعت کی افتاد کو کیا کہوں۔ کوئی اچھا شخص ہوتا ہے یا کوئی اچھا شغل تو معلوم نہیں کیوں اور کیسے دل میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ نہ یہ آدمی مرے گا نہ شغل ختم ہوگا۔ پھر ایسے کو کیا کہوں جو دونوں ایک ہی تھا۔ وفات کی خبر سنی تو پہلا جھٹکا اسی کا لگا، ارے ذاکر صاحب اور یہ جہاں دونوں کا قراں تھا۔ اقدار کو موت نہیں اس لیے کہ ان کا حامل خود واصل بحق ہو کر ان کو لازوال کر جاتا ہے۔ اعلیٰ اقدار کی حیثیت علوم متداول کے بندھے ٹکے اصول یا ظن و تخمین کی نہیں ہوتی۔ ان کو تائید و توانائی ملتی ہے افراد کے اعلیٰ عقیدے اور عمل صالح سے۔

حادثے کی خبر سنتے ہی وہ ہوا جو بے اختیاری میں اکثر ہوا کرتا ہے۔

جیسے اپنا وجود رہ گیا ہو نہ شعور۔ درد و درماندگی اور گذرے ہوئے دنوں کی یادوں کا اجڑا ہوا قافلہ مرحوم کی تحریم و تعاقب میں رواں دواں ہو گیا۔ آواز سے بے اختیار رونے لگنا وہ بھی نوکروں بچوں اور عورتوں کے سامنے بڑھاپے میں زیب نہیں دیتا لیکن کیا کروں حادثہ سخت ہو تو آدابِ محفل کو ملحوظ رکھنا میرے لیے بڑا مشکل ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہونے لگا اور کیا عجیب یہ احساس تھا کہ اس حادثے اور ایسے حادثے کے بعد اپنی تمام خوبیاں متاع کاسد اپنے تمام کارنامے بے نور وہ تمام تعبیریں مسمار، وہ سبز و شاداب باغ جھلس گیا اور نہریں، خشک ہو گئی ہوں اور امید و حوصلے کے وہ سفینے غرق ہونے لگے ہوں جن سے کبھی ذہن اور تخیل کی فضا معمور، منور اور معطر تھی۔ جیسے کسی جدید ترین ہولناک بم کے پھٹنے سے آدمی، جانور، ہوا، پانی، نباتات و جمادات اور ہر وہ چیز جو دیکھی یا محسوس کی جا سکتی تھی مسخ، معدوم اور پاش پاش ہونے لگی ہو۔ طبیعت کو جلد ہی قابو میں لانا پڑا تاکہ لوگ میری طرف متوجہ رہنے کے بجائے اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جائیں اور میری وہ پشیمانی کم ہو جائے جو ان سب کے سامنے بلند آواز سے گریہ کرنے سے پیدا ہو گئی تھی۔

پھر ایسا معلوم ہوا جیسے ۱۹۱۵ء سے اب تک کا فصل زمانی و مکانی یک قلم مٹ گیا ہو اور ذاکر صاحب کے ساتھ اور ان سے دور اور نزدیک رہنے کے سارے واقعات، اور کیسے کیسے واقعات، جن سے محبت و منزلت کی زندگی عبارت تھی اپنے تمام تنوع و تفصیل کے ساتھ دفعتہً حافظے میں جگمگا اٹھے ہوں ماضی اور حال پر ایک ناچیز مخلوق کو یہ قدرت حاصل ہو تو اس علیم و قدیر کے اختیار و اقتدار کے بارے میں کون شک کر سکتا ہے جس کی ذات میں ماضی، حال اور مستقبل بیک وقت و ہمہ وقت پیوست و پابندہ ہوں۔ مستقبل کا علم

مخلوق کے لیے چاہے جتنا ناممکن ہو خدا نے ہم کو یہ استعداد ضرور بخشی ہے کہ ہم مستقبل پر حکم نہ چلا سکیں تو اس کے غلام بھی نہ بنیں۔ انسانی زندگی میں ماضی اور حال ہی کے خیاباں اور خارزار سے مستقبل کا خیاباں اور خارزار نمو اور نمود پاتا ہے! جو شخص ذاکر صاحب کے اس دنیا کے بے شمار حسنات سے واقف ہو وہ ان کی آخرت کے بیش از بیش اجر و انعام کا اندازہ آسانی کے ساتھ لگا سکتا ہے۔

جو پیدا ہوا وہ مرے گا۔ اس سے زیادہ مہیب، ناقابلِ فہم اور ناقابلِ انکار حقیقت اب تک دریافت نہیں ہو سکی ہے۔ کتنی برحق اور کیسی کرب انگیز! یہ کرب کتنا بڑھ جاتا ہے جب رخصت ہونے والے میں وہ صفات یکجا ہو گئی ہوں جن کو اس نے نفس کے کیسے سرکش مطالبات سے منھ موڑ کر جن سے اس زندگیِ دو روزہ کی لذتیں وابستہ ہوں، جو زندگی کے دو روزہ ہونے کی وجہ سے اور زیادہ پرکشش اور ناقابلِ تسخیر ہوتی ہیں، اپنے اور اپنوں کے لیے نہیں بلکہ دوسروں کی اچھائی اور بھلائی کے لیے اکتساب کیے ہوں۔ موت پر اب تک صرف انسانیت فتح پا سکی ہے۔ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ فہم و ادراک سے بیرون و برتر مشیت الٰہی میں انسان کا درجہ کتنا حسین و عظیم ہے۔ ذاکر صاحب اس حسین و عظیم کا نمونہ و نمائندہ تھے۔ کہتے ہیں ہر شخص کا مقدر پہلے سے متعین ہو چکا ہے جس سے وہ باہر نہیں جا سکتا۔ غالب نے اسی مایوس و منفی تصور کے پیشِ نظر اپنی بے دلی اور بے باکی کا اظہار کیا ہے، جب وہ کہتے ہیں۔ ع

نقل کرتا ہوں اسے نامۂ اعمال میں میں　　کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی!

لیکن اس جہان سے ایسے مردانِ حق بین و حق آگاہ گزرے ہیں اور گزرتے رہتے ہیں جن کو اپنی تقدیر اور اپنے ساتھ انسانیت کی تقدیر لکھنے

کی تائید اس قدر جلیل اور رحمتِ عظیم سے ملتی ہے جس کا انکشاف اور جس پر ایمان انسانی شعور و شرف کی معراج ہے۔ ذاکر صاحب کو میں ان ہی مردانِ حق بین و حق آگاہ میں سمجھتا ہوں۔ بڑے آدمیوں کی زندگی یہی بتاتی ہے کہ وہ جس درجے پر فائز ہوئے وہ ان کو کسی صبح و شام کو قانوناً یا اتفاقاً نہیں مل گیا تھا بلکہ بہت دنوں میں بڑی سخت آزمائش سے گزرنے کے بعد میسر آیا تھا۔ مجبوری یا مختاری کا مسئلہ اتنا اعتراف و انقیاد کا نہیں ہے جتنا عزم و اعتقاد کا۔ خدا اور انسان کا ایسا تصور بھی ہو سکتا ہے جہاں مروجہ نظریہ جبر خدا اور انسان دونوں کے شایانِ شان نظر نہ آئے۔ خدا نے انسان کو جب اپنے پر بنایا ہے تو اس میں زیادہ صفات ایسی ہی رکھی ہوں گی جو دونوں کی منزلت پر گواہ ہوں۔ یہ صفات وہ ہوں گی جو صرف انسان کو ودیعت ہو سکتی ہیں فرشتوں کو نہیں۔ اس لیے کہ موخر الذکر کو جرأت اقدام INNITATIVE نہیں دی گئی ہے، ان کے لیے صرف ایک وظیفہ انقیاد و طاعت کا مقرر ہے جس سے وہ باہر نہیں ہو سکتے۔ دلیل نہیں اپنے احساس کی بنا پر کہوں گا کہ جب کبھی خیر کی طرف مائل ہوا تو بے اختیار محسوس کیا۔ جیسے یہ خدا کی طرف سے مجھے دیا ہوا اختیار ہے جسے میں پوری مختاری سے کام میں لا رہا ہوں۔ لیکن جب کبھی برائی نے کھینچا اور اس کا ارتکاب کیا تو ہمیشہ اپنے اختیار کو اس کا باعث سمجھا۔ جبر و اختیار کی میرے نزدیک ایک تعبیر یہ بھی ہے۔ یہ مثل صحیح ہے کہ کوئی شخص اپنے نج کے ملازم کی نظر میں دیر تک معصوم یا مقدس (سینٹ) نہیں رہ سکتا۔ نج کا سادہ لوح ملازم مالک یا مرشد کی کمزوری یا کمزوریوں کو اس کی کرامات پر بھی محمول کر سکتا ہے ایسے ملازم سے کہیں زیادہ ساتھی طالب علموں کی نظر ہمہ گیر، ہمہ آشنا، سفاک اور بے باک ہوتی ہے جیسے ایکسرے کی شعاعیں جو گوشت اور ہڈی میں نفوذ کر کے صورت حال کا انکشاف

کرلیتی ہیں۔ بعض ساتھی طالب علموں کا وطیرہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے سے بہتر و برتر رفیق یا حریف کی معمولی سے معمولی کمزوری کا پتہ لگا کر اپنی سنگین سے سنگین کمزوری یا لغزش کو وجہ جواز قرار دیتے ہیں۔ ادنیٰ درجے کے شخص کو سب سے زیادہ تسکین اسی طرح کی نالائقی میں ملتی ہے اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ اور ایم اے او کالج علی گڑھ کے ذاکر صاحب کے ساتھی ابھی کافی تعداد میں بقید حیات ہیں۔ ان میں ایسے بھی ہوں گے جو ذاکر صاحب کو عزیز و محترم نہ رکھتے ہوں گے۔ ایسے بھی مل جائیں گے جو ان سے بغض و کینہ رکھتے ہوں گے۔ وہ بھی نہیں بتا سکتے کہ ذاکر صاحب سے کبھی کوئی لغزش ایسی ہوئی جو سنِ شعور سے فارغ التحصیل ہونے تک ان کے اچھے سے اچھے طالب علم، اچھے سے اچھے رفیق اور اچھے سے اچھے انسان ہونے کی حیثیت کو بے نور یا داغدار کرتی ہو۔

افترا پردازی، شر انگیزی اور آبروریزی کا سب سے بڑا موقع وہ ہوتا ہے جب کوئی شخص الکشن میں منتخب ہونے کے کھڑا ہوتا ہے۔ کالج کے زمانے میں ذاکر صاحب کو اس آزمائش سے گزرنا پڑا تھا۔ جب وہ یونین کے نائب صدر ہونے کے امیدوار تھے۔ اس زمانے میں یونین کے صدر کی وہی حیثیت تھی جو آج صدر کی ہے۔ طالب علموں کا سب سے بڑا نمائندہ ہونے کے اعتبار سے اس کی منزلت قریب قریب اتنی ہی تھی جتنی اسٹاف کے کسی لکچرر کی۔ کتنا فصل اور فرق آگیا ہے اس عہد کے طالب علموں کے نمائندے کے درمیان۔ پہلے وہ اپنی تعلیم گاہ کا سفیر اور اس کی روایات کا امین ہوتا تھا، اب سیاسی اشخاص اور اداروں کا تابعدار و حکم بردار۔ کیسی خواری، کتنی عبرت! الکشن سے زیادہ معرکے اور دھوم کی کوئی اور تقریب کالج میں نہیں منائی جاتی تھی۔ بے ہودگی نام کو نہ ہوتی جو آج کل کے الکشنوں میں بالعموم دیکھی

جاتی ہے۔ یہ الکشن سیاسی پرچھائیوں میں منعقد ہوتے ہیں اور جہاں سیاسی پرچھائیاں پڑ رہی ہوں وہاں کیا نہ ہوتا ہوگا! کالج کے ان انتخابات میں شریف گھرانوں کے نوجوان جن کی تربیت اچھی روایات اور صحت مند ماحول میں ہوئی ہوتی شوخی و شرارت کے ایسے شگوفے چھوڑتے کہ حریف بھی داد دیے بغیر نہیں رہتا تھا۔ الکشن کے زمانے کی ان گمنام تحریروں (نظم و نثر) کو دیکھ کر یہ بات ماننی پڑتی تھی عریاں نگاری دراصل فنکار کی نارسائی ہے ورنہ لکھنے کا سلیقہ ہو اور ذہنیت مریضانہ نہ ہو تو عریانی، شوخ شگفتگی یا شگفتہ شوخی سے متجاوز نہیں ہوتی۔ کیسے کیسے گمنام فنکار اس زمانے میں کالج میں تھے یا ذاکر صاحب کا یہ تن تنہا امتیاز ہے کہ ان پر کسی قسم کے چھینٹے نہیں اڑائے گئے طنز اور ہجو کے تو کیا خوش طبعی اور شوخی کے بھی نہیں۔

وہ زمانہ کبھی نہ بھولے گا اور ذاکر صاحب کے اٹھ جانے کے بعد اس کو بھلا دینے یا اس کی شدت کے کم ہونے کا امکان اور بھی کم ہو گیا جب وہ صدر مملکت کے انتخاب کے لیے کھڑے ہوئے تھے اور پریس کا ایک سیکشن ان کے کردار کو مسخ اور مجروح کرنے کے لیے کیسی کیسی نجاست اچھال رہا تھا فتنہ سازی، افترا پردازی اور آبروریزی کی کوئی حد نہیں چھوڑی تھی۔ اتنا تک لحاظ نہیں رکھا تھا کہ الکشن کسی تربیت نایافتہ دور افتادہ گاؤں کی پنچایت کا نہیں۔ ہندوستان کے صدر مملکت کا تھا۔ انتخاب کے زمانے میں فریقین کے ہفوات پڑھنے سے حتی الوسع بچتا ہوں لیکن ذاکر صاحب سے متعلق اس پریس کی ہرزہ سرائی پر سرسری طور پر کبھی کبھی ایک نظر ڈال لیتا تھا اس خیال سے کہ شاید دو چار ہفتے کے اندر اس پریس کو ذاکر صاحب سے متعلق کچھ ایسی باتیں دریافت ہو گئی ہوں جو مجھ کو ان سے قریب رہتے ہوئے ۵۲ سال میں نہ معلوم ہو سکیں۔ آخر میں صرف یہ معلوم ہوا کہ ذاکر صاحب کے بارے میں

جن باتوں کی تشہیر کی گئی تھی وہ ان کی وقعت کو کم نہیں بلکہ بڑھاتی تھیں اور کوئی بھی ایسا نہ تھا جو ان باتوں سے پہلے واقف نہ تھا۔ ذاکر صاحب ان چند لوگوں میں تھے یا شاید تنہا ایسے شخص تھے جن کے خلاف کوئی سیاسی یا فرقہ وارانہ جماعت کوئی لغزش نہ دریافت کر سکی نہ ایجاد کر سکی۔

بایں ہمہ ذاکر صاحب شروع سے آخر تک کبھی بھی رہن سہن، شکل صورت، وضع قطع، میل جول، ہنسنے بولنے، رزم و بزم، تفریح و تفنن کے اعتبار سے دور دور تک عابد و زاہد یا سادھو سنت نہ تھے بلکہ ان میں تھے جن کے بغیر ہر محفل سونی ہوتی تھی۔ جہاں ہوتے اس کی رونق و اہمیت کئی گونہ بڑھ جاتی۔ اجتماع کیسا ہی ہو، مہمان خصوصی کوئی ہو، سب کی نظر ذاکر صاحب ہی پر پڑتی۔ ان کی موجودگی سے مجلس کا ٹون صحت مند خوشگوار اور بلند ہو جاتا۔ ذہانت، شخصیت اور انسانیت میں سب ان کو اپنے سے بلند و بہتر سمجھتے تھے ان کے معاصرین خواہ شناسا ہوں یا اجنبی کسی جولانگاہ میں ذاکر صاحب کو رشک و رقابت کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ وہ ہر ایک کے محبوب و محترم تھے۔ ہر شخص ان کی خوبیوں کا خوشی اور فخر سے اعتراف کرتا۔ اس عام محبت و عقیدت کو ان روایات سے بھی تائید ملی تھی جو ذاکر صاحب کے دو بڑے نیک نام اور نامور حقیقی بھائیوں نے کالج میں چھوڑی تھیں۔ کیا بتاؤں اس زمانے کے کالج کے شریف نوجوانوں میں اعلیٰ روایات کی کیسی کارفرمائی تھی، اس کا کتنا احترام کیا جاتا تھا۔ روایات نہ ہونے پر یا اس بار گراں و گرامی کو اٹھانے کی توفیق نہ ہونے ہی سے تو وہ برے دن دیکھنے پڑ رہے ہیں جو بجائے خود برے نہیں ہوتے صرف مشکل تر اور عجیب تر تقاضے لاتے ہیں جن سے اپنی بعض کمزوریوں کے سبب سے نہ ہم آنکھ ملا سکتے ہیں نہ پنجہ۔ اس طرح اس مے مردافگن عشق کو کوئی حریف نہیں ملتا۔ ذاکر صاحب کے بعد ان کی قد و قامت

کی کوئی شخصیت علی گڑھ کے افق سے طلوع ہو سکے گی یا نہیں۔ اس کا جواب تلاش کرنا اتنا ضروری نہیں معلوم ہوتا جتنا اس کے لیے حوصلہ رکھنا اور دعا کرتے رہنا۔ یہ اس لیے کہتا ہوں کہ جیسا کہ ہوتا آیا ہے ایسا شخص علی گڑھ ہی کے زندانِ قدح خوار سے اٹھے گا۔

ام۔ اے۔ او کالج کی اس عہد کی فضا جو سر سید اور ان کے رفقائے کرام کی شخصیت اور خدمات سے تازہ و تابناک تھی اور ذاکر صاحب کی طویل رفاقت نے اچھا آدمی بننے اور رہنے کا شوق دیا۔ اس کا نہ دعویٰ نہ ایسے دعوے کی کوئی اہمیت کہ اس شوق نے مجھے تمام کمزوریوں سے پاک کر دیا۔ ائمہ معصومین سے قطع نظر، کمزوریوں سے پاک ہونا انسان کی فضیلت نہیں اس لیے کہ یہ کمزوریاں بعض بڑی مصالح کی بنا پر اس میں رکھی گئی ہیں۔ البتہ علی گڑھ اور اس سے متعلق اچھی باتیں جسم و جان میں اس طرح پیوست ہو گئیں کہ دوسرے اور تیسرے درجے کی باتوں کی طرف دل مائل نہیں ہوا۔ جیسے امراض سے محفوظ رکھنے کے لیے فطرت انسانی جسم میں دفاعی اور امتناعی قوت ودیعت کر دیتی ہے، ان عوامل نے ہر کرائسس (نازک مواقع) میں میری مدد کی۔ تقاضائے عمر سے جوں جوں قویٰ ضعیف اور معطل ہونے لگتے ہیں، امراض سے بچنے یا ان کا مقابلہ کرنے کی طاقت گھٹنے لگتی ہے۔ اور وہ وقت آجاتا ہے جو بالآخر آکر رہتا ہے۔ دوسری طرف اخلاقی توانائی جو صرف انسان کا کارنامہ ہے مرورِ ایام سے گھٹتی نہیں بلکہ بڑھتی رہتی ہے۔ اس سے فطرت اور انسان دونوں کے مرتبہ اور سطح کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ادارے اشخاص سے اہمیت حاصل کرتے ہیں اور اسی اعتبار سے یہ مردود یا معظم قرار پاتے ہیں۔ میرے عہد کا علی گڑھ اس کے بانیِ اعظم کے بعد جن شخصیتوں سے معظم ہوا ان میں ذاکر صاحب کا درجہ نمایاں اور قابلِ فخر ہے۔

مسلمان ہوں، عبادت مآبوں کی نہیں خدمت گزاروں کی نظر میں اپنی اچھی صلاحیتوں یا کارگزاریوں کا سرچشمہ ان عقائد، اعمال، اقدار، احکام اور روایات کو جانتا ہوں جو اللہ نے اپنے اچھے اور اچھے سے اچھے بندوں کے ذریعہ مجھ تک پہنچائے اور پہنچاتا رہتا ہے۔ ان میں ان عزیزوں، دوستوں اور بزرگوں کا بھی کچھ کم حصہ نہیں ہے جن کی اعلیٰ شخصیت اور کردار نے اللہ کے احکام اور اس کے بندوں کے حقوق کو پہچاننے اور ان کو بجا لانے میں میری ہمت افزائی کی۔ علی گڑھ سے تقریباً مدت العمر سے وابستہ ہوں۔ یہاں ایسے اشخاص اور حالات سے بھی سابقہ ہوا جن کو اپنے زندگی کے اچھے دنوں میں شمار نہیں کرتا۔ ایسے اشخاص اور امور سے سابقہ ہونے پر اور زیادہ اس کا یقین ہوا کہ ہماری تاریخی عظمتوں اور خودداریوں کا جس کا ایک سمبل علی گڑھ بھی تھا، کیسا عجیب و غریب فیضان تھا کہ اس نے کسی حال میں اپنے یا دوسرے سے کبھی مایوس یا بیزار نہیں ہونے دیا بلکہ یہ عظیم حقیقت منکشف کر دی کہ نیکی اور سچائی جتنی اقلیت میں ہوگی اتنی ہی زیادہ بالآخر بدی اور باطل کی قوتوں پر غالب آئے گی۔ ذاکر صاحب جامع حیثیات اور جامع حسنات دونوں تھے۔ گذشتہ ۶۰۔۷۰ سال میں ہندوستان کے مسلمانوں میں، جن میں دوسرے ممالک کے مسلمانوں کو شامل کر لیا جائے، جب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مسلمانوں میں ذاکر صاحب جیسا جامع صفات شخص پیدا نہیں ہوا۔

مدت الایام طرح طرح کے عوارض کا شکار رہنے کے باعث ہمارا مزاج کچھ اس طرح کا بن گیا ہے کہ ہم اپنے اچھے افراد، اداروں، اقدار، روایات اور اخلاق و مذہب میں کوئی نہ کوئی خامی فرض کر لیتے اور اس کے اچھالنے میں غیر معمولی تسکین و فخر محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ایسوں کے نزدیک کوئی

بڑائی بڑائی نہیں ہے، غلط اندیشی یا خوش فہمی ہے! البتہ اتنا سمجھنے سے معذور رہتے ہیں کہ بڑائی نالائقی سے کبھی کبھی اس طرح بھی انتقام لیتی ہے۔ اگر خدا، قیامت، سزا جزا، رسولِ پاک (آیۂ رحمت) کی شفاعت اور تخلیق انسان کا مقصد و عظمت کا وہ تصوّر صحیح ہے جو مذہب نے بتایا ہے اور جس پر مجھ سے پہلے اور آج بھی بے شمار و بدرجہا بہتر و برتر مسلمانوں کا ایمان رہا ہے، جن کے نقوش تاریخ کے صفحات اور دنیا کے چپے چپے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ تو اس پر یقین رکھتا ہوں کہ ذاکر صاحب آخرت کی ہر منزل میں اپنے پیدا کرنے والے کے حضور میں عقل و عشق کی اسی سپردگی و سرفرازی کے ساتھ حاضر ہوں گے اور واصل رہیں گے جن کی جھلک ان کی زندگی میں ہم دیکھتے تھے، جب وہ خدا کے بندوں کے درمیان تھے، ہر چھوٹے بڑے کے رنج و راحت میں شریک ہوتے اس وقار، محبت اور فروتنی سے جو اچھے مسلمان اور اچھے انسان کا شیوہ رہا ہے۔

ذاکر صاحب ہر شخص کو عزت و محبت کا مستحق سمجھتے تھے۔ طالب علمی کی زندگی سے لے کر آخری جدائی تک انہوں نے بھولے سے بھی کسی موقع پر اپنی برتری نہیں جتائی۔ پردہ داری اور پردہ پوشی، عفو و درگزر ان کی سیرت کا بڑا نمایاں اور قیمتی جوہر تھا۔ کسی موضوع پر بحث ہوتی، اس میں تحمل، توازن اور خوش دلی ملتی۔ گفتگو سہل اور سادہ ہوتی ہوئی پُر معنیٰ، فکر انگیز، اور پُر معنیٰ اور فکر انگیز ہوتے ہوئے سہل اور سادہ ہوتی۔ یہ بات میں نے بڑے بڑے مشیخت مآب لوگوں میں نہیں پائی۔ علمی بحث میں قطعاً علمی انداز اور اعلیٰ سطح پیش نظر رکھتے۔ اشارۃً کنایۃً بھی اس کا اظہار نہ ہوتا کہ اپنی بات منوانا چاہتے ہیں۔ جب کہ آج کل کے کتنے لکھے پڑھے برخود غلط بوڑھے

اختلاف رائے پر، اگر مخاطب شریف ہو تو آبرو ریزی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کوئی منافشہ ہوتا تو صلح صفائی کرانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ فریقین کتنے ہی ضدی اور غیر ذمہ دار کیوں نہ ہوتے ذاکر صاحب کے حکم بنائے جانے پر بلا تامل راضی ہو جاتے۔ اس کی بڑی اچھی مثالیں ان کی صدارت میں راجیہ سبھا کے اجلاسوں میں ملتی تھیں۔ ان کی وفات پر سیاسی جماعت کے نمائندوں نے جو ہدیۂ عقیدت پیش کیے ان میں ایک ممتاز کمیونسٹ ممبر کا یہ کہنا کہ ذاکر صاحب اپنی صدارت میں اپوزیشن کے تحفظ کو بھی ملحوظ رکھتے تھے بڑا تاریخی اور قابلِ قدر فقرہ ہے۔ شاید کسی اپوزیشن نے دنیا کے کسی سیاسی ادارے کے صدر کے اعزاز میں ایسا ہدیہ نہیں پیش کیا ہوگا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ذاکر صاحب کے تصفیہ پر کسی نے بددلی یا اپنے غیر مطمئن ہونے کا اظہار کیا ہو۔ اس لیے کہ وہ دانشمندی سے اور قطعاً غیر جانبدار ہو کر تصفیہ کرانے کی کوشش کرتے تھے۔ علی گڑھ میں طلبہ کی یونین کی نائب صدارت سے لے کر ہندوستان یونین کی صدارت تک ہر موقع اور معرکہ میں ذاکر صاحب کی شخصی دانش و دیانت ان کی منصب پر سایہ فگن اور اثر انداز رہی۔ بڑے آدمی کی یہ بڑی قابلِ لحاظ علامت ہے!

مایوس و ملول کو امید و اعتماد سے آشنا کرا دینا ذاکر صاحب کی شخصیت کا غیر معمولی امتیاز تھا۔ وہ معمولی باتوں کی تلقین کرتے تھے لیکن بڑے نتائج کی بشارت دیتے جو بالعموم صحیح ثابت ہوتی۔ ممکن ہے ایسے لوگ ہوں جو ذاکر صاحب کے مشورے پر عمل کر کے ثروت و اقتدار کے درجے پر پہونچ گئے ہوں لیکن میرے علم میں متوسط درجے کے بیشتر ایسے لوگ ہیں جو ذاکر صاحب کے مشورے پر کاربند ہو کر اور معمولی کامیابیوں سے دوچار ہو کر اپنے سے مسرور و مطمئن رہنے لگے۔ ان میں یہ تبدیلی کسی مجہول قناعت کے سبب

سے نہ آتی جو افراد و اقوام کی حوصلہ مندی اور خطر پسندی کو مفلوج کر دیتی ہے بلکہ یہ اس سادہ پسندی اور بلند خیالی کی بنا پر ہوتا جو ذاکر صاحب ان میں پیدا کر دیتے۔ ذاکر صاحب جب تک جامعہ ملیہ کے براہ راست سردار و سالار رہے اراکینِ جامعہ میں قناعت کی تونگری بڑی واضح تھی۔ ذاکر صاحب آج سے نہیں ہمیشہ سے ینگ ٹرکس (YOUNG TURKS) اور اولڈ گارڈ (OLD GUARDS) دونوں کی نظر میں یکساں معتبر و محترم رہے، اس لیے نہیں کہ وہ کوئی بے ضرر سادھو یا پیر فقیر تھے بلکہ دونوں جانتے تھے کہ ذاکر صاحب ان کی خوبیوں اور خامیوں سے واقف تھے اور کسی طرح کی دھاندلی یا للو پتو سے زیر نہیں کیے جا سکتے تھے، اس حقیقت سے بھی بے خبر نہ تھے کہ ذاکر صاحب ہمیشہ سے ینگ ٹرکس سے زیادہ ینگ ٹرک اور اولڈ گارڈس سے زیادہ اولڈ گارڈ تھے۔ ایک چیز جو اب تک جامعہ کے چھوٹے بڑوں میں نمایاں ہے جو کلیتہً ذاکر صاحب کی دین اور جامعہ کی روایت بن گئی ہے وہ اربابِ جامعہ کا سلیقہ، صفائی، میل و محبت سے رہنا، گرد و پیش کو صحت افزا، خوبصورت اور دلکشا رکھنا اور بالعموم صاف ستھرا اور سجل لباس پہننا ہے۔

جامعہ اب بہت پھیل گئی ہے۔ علی گڑھ کا بھی یہی حال ہے۔ علمی و تہذیبی اداروں کو جیسے کہ یہ ہیں اس طور سے پھیلانا یا پھیلنے دینا اچھا نہیں۔ ان کو علمی و تہذیبی ہی رکھنا بہتر ہے۔ دوسرے اور مختلف خطوط پر ان کی توسیع بے معنی بھی ہے اور مضر بھی۔ یونیورسٹیوں کو کثیر المقاصد، ہمہ جہت اور ہمہ گیر نہ ہونا چاہئے۔ ہر علم و فن کی یونیورسٹی کا علیحدہ ہونا ضروری ہے تاکہ تمام تر توجہ اور تگ و تاز اسی مقصد کے حصول پر مرکوز رہ سکے۔ بصورت دیگر ادارے کے انتظامی و اخلاقی دروبست میں فرق آنے لگتا ہے۔ گو

مخصوص دشواریوں کی بنا پر ایسا کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ یہ باتیں خاص طور پر اس لیے کہنی پڑیں کہ کثیر المقاصد اور ہمہ جہت و ہمہ گیر یونیورسٹیوں کے لیے سالارِ اعظم بھی ذاکر صاحب ہی کی مانند ہمہ صفت موصوف ہونا چاہیے۔ وہ ہر طرح کے تعلیمی اداروں کے تقاضوں کو پہچانتے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان میں ایسی اخلاقی توانائی، بلندی اور دیدہ دانش تھی جن سے ادارے کی قدر و قیمت اور اس کے متعلقین و متوسلین اپنی بہترین صلاحیتوں کو برسرِ کار لانا اپنا فریضہ اور فخر جانتے تھے۔ یہی وہ باتیں ہیں جن کے نہ ہونے سے آج تعلیمی اداروں میں وہ سب ہو رہا ہے جو نہ ہونا چاہیے لیکن ذاکر صاحب جیسی شخصیت اب پیدا کہاں ہو رہی ہے۔ جن عقائد اقدام اور روایات کے وہ ساختہ پرداختہ تھے ان کی قدر و قیمت نہیں رہی لیکن ان کے فقدان کو ہم ہر لحظہ محسوس کرتے رہتے ہیں۔ اکثر یہاں تک خیال آیا ہے کہ استثناء سے قطع نظر آج کل کی یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر اس قدر و قامت کے کیوں نہیں ہوتے جتنے پچاس ساٹھ سال پہلے بیشتر اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر اور کالجوں کے پرنسپل ہوتے تھے۔

ان کا حال

ذاکر صاحب کا ماضی ان کے حال سے اور ان کے ماضی سے کم شاندار نہیں رہا ہے۔ لیکن اس کا تذکرہ انہوں نے کبھی نہیں کیا۔ ہر بڑے آدمی کی طرح ان کو اس امر کا احساس تھا کہ حال کو ماضی پر فخر کرنے کے بجائے ماضی کو حال پر فخر کرنا چاہیے۔ کسی محفل میں ہوں۔ ناقابل برداشت بوڑھوں اور معصوم بچوں کی مانند نہ وہ اس کے خواہش مند ہوتے نہ اسے گوارا کر سکتے تھے کہ حاضرین کی تمام تر توجہ، تواضع و تکریم ان ہی کے لیے وقف رہے اس کے برخلاف خاص طور پر کوشاں رہتے تھے کہ وہ خود دوسروں کی طرف

زیادہ سے زیادہ متوجہ رہیں میں نے ان کو کسی سے کانا پھوسی کرتے آج تک نہیں دیکھا۔ ذاکر صاحب کا یہ امتیاز بذاتِ خود مجھے نہایت درجہ پسند تھا اس لیے کہ میں نے بعض تعلیم یافتہ مہذب اور ماڈرن مردوں عورتوں کو اس بدتمیزی میں مبتلا پایا کہ دو سے زیادہ آدمی موجود ہوں اور دو شخص کانا پھوسی شروع کر دیں۔ اس سے بھی بڑی بدتمیزی یہ ہے کہ حاضرین میں سے کوئی شخص بالخصوص میزبان پوچھنے لگے کہ کیا کانا پھوسی ہو رہی تھی! بدنصیبی سے کسی شخص کو بدنصیبی یا رسوائی پیش آجائے تو اس کی تجسس یا ٹوہ لگانے سے جیسا کہ بعض نالائقوں کا شیوہ ہے، بہت دور رہ کر اس کی پردہ پوشی کرنا ذاکر صاحب اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ بظاہر یہ بات معمولی معلوم ہوتی ہے لیکن آج کل سوسائٹی کا جو حال ہے اس میں جس بے رحمی اور بے حیائی سے ہم سب بالخصوص تعلیم یافتہ، معمر اور مسلمان کسی بدنصیب کی رسوائی کی اشاعت میں حصہ لیتے اور لطف اٹھاتے ہیں وہ بھی کوئی راز نہیں ہے۔

ذاکر صاحب نے شاید ہی کسی کو تم کہا ہو۔ بڑوں کا کیا ذکر چھوٹے بچوں کو بھی وہ ہمیشہ آپ کہہ کر مخاطب کرتے اور پیار کرتے تھے۔ بچے بوڑھوں کی طرف کم ملتفت ہوتے ہیں لیکن ذاکر صاحب میں ان کے لیے کچھ ایسی کشش تھی کہ بے اختیار ان کی طرف مائل ہوتے۔ جامعہ کے ابتدائی دنوں میں جب وہ اوکھلے (جامعہ نگر) کو منتقل ہوئی تھی کبھی وہاں جانے کا اتفاق ہوتا تو ہمیشہ یہی محسوس کرتا کہ جیسے جامعہ کی فضا اور جامعہ کا سمبل (نشان امتیاز) معصوم بچے اور معظم ذاکر صاحب تھے۔ ذاکر صاحب کی شفقت اور بچوں کی شگفتگی کے ساتھ معلوم نہیں کیوں اس وقت شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم کی یاد آئی۔ کتنی حزیں اور دلنشین! لیکن جلد ہی ذاکر صاحب، شفیق صاحب اور جامعہ کے اکٹھا تصور سے

تسکین بھی ملی۔ اعلیٰ یادیں اور عظیم یادگاریں چھوڑ جانا بھی انسان کا کتنا بڑا امتیاز ہے جیسے خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں میں یہ لوگ اضافہ کرتے جاتے ہوں۔ ذاکر صاحب بچوں کو کوئی قصہ کہانی نہ سناتے نہ ان کو نصیحت کرتے یا ڈراتے۔ ہمیشہ ان کی پسند یا ناپسند، کھیل کود لباس اور کھانے پینے اور ان کے میل و محبت کی باتیں کرتے جس میں اب تک ان کا نظیر دیکھنے میں نہیں آیا۔ بچے نہ ان کو بوڑھا سمجھتے نہ جوان نہ ملا یا ماسٹر نہ اپنا کوئی رشتہ دار، بلکہ اپنا جیسا سمجھنے لگتے۔ بوڑھے پر کمسن، معصوم بچوں کا یہ اعتبار کچھ کم قابلِ فخر و امتیاز نہیں ہے۔ جس پر سب سے زیادہ ایک معلم ہی فخر کر سکتا ہے۔ انہی روزوں میں ایک شام کو حسبِ معمول ذاکر صاحب اس میدان کی طرف جا نکلے جہاں چھوٹے بچے کھیل میں ہمہ تن مصروف دھومیں مچا رہے تھے۔ ایک بچے نے ذاکر صاحب کو آتے دیکھا تو کھیل چھوڑ کر دوڑتا ہوا آیا اور ان کی انگلی تھام کر کچھ دور چلا لیکن توجہ تمام تر ساتھی کھلاڑیوں کی طرف تھی۔ بالآخر نہ رہا گیا، انگلی چھوڑ کر کچھ کہے سنے یا رسم بجا لائے بغیر دوڑ کر کھیل میں شامل ہو گیا۔ دو تین اور بچوں نے بالکل اسی طرح اس ڈرامے کو دہرایا۔ ذاکر صاحب مسکرائے، پھر بولے، یہ بچے بھی خوب ہوتے ہیں!

ذاکر صاحب نے اپنے آلام و آزار کا خواہ وہ جسمانی ہوں یا ذہنی برملا کبھی اظہار نہیں کیا۔ کسی تکلیف میں مبتلا ہو جاتے تو دریافت حال کرتے پر یہی بتاتے کہ تیزی سے زائل ہو رہی ہے۔ کبھی کبھی اس تیزی سے جیسے لاحق ہونے سے پہلے ہی زائل ہونے لگی ہو! ذاکر صاحب پر بیماری کے شدائد غالب آنے لگتے تو کراہنے اور بے اختیار ہونے کے بجائے کسی خوش الحان حافظ یا قاری سے کلام پاک سنتے۔ رفتہ رفتہ ان پر سکون طاری ہونے لگتا اور نیند آجاتی۔ اللہ اور اس کے کلام میں اس طرح تشفی و تقویت پانے والے وہی ذاکر صاحب

تھے جنہوں نے دیارِ غیر میں غضب ناک خونیوں کے نرغے میں تنہا، بیماری سے نحیف و نزار، قاتلوں کے بھیانک اشاروں وارادوں کے جواب میں ایک تبسم کے ساتھ کہا "الحمد للہ مسلمان ہوں۔ جہاں چلنا ہو چلیے"! جانے پہچانے والے یا دوست اور عزیز آس پاس ہوں تو نہ معلوم کتنی باتوں کا لحاظ کرتے ہوئے آدمی اپنی ثابت قدمی اور دلیری کا اظہار کر سکتا ہے۔ لیکن جہاں دور دور تک اپنا کوئی نہ ہو اور موت نزدیک سے نزدیک آچکی ہو وہاں صرف اللہ کے دیے ہوئے ایمان و عقیدے پر بھروسہ کر کے قاتلوں کو ایسے الفاظ میں، اس اطمینان و انداز سے چیلنج دینا معمولی بات نہ تھی رہبر مذہب کے پیروؤں میں ایسے لوگ ملتے ہیں جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنی عزیز ترین متاع قربان کر دی لیکن اپنی زندگی میں اپنوں میں ایسی مثال دیکھی نہ سنی۔ ان دنوں مسلمانوں کو جس قیامت کا سامنا ہے وہی کیا کم تھا کہ خود ان میں ایسے افراد کا ظہور ہونے لگا ہے جو اپنے اچھے سے اچھے لوگوں کو اس کی وفات کے بعد اپنی بُری سے بُری صلاحیتوں کا نشانہ بناتے رہتے ہیں۔ اخلاق و شرافت کے صحیفہ میں ایک آیت اس مضمون کی بھی ملتی ہے کہ جس کی وفات ہو گئی ہو اس کے خلاف دشنام و بہتان سے پرہیز کرنا چاہیے اس لیے کہ وہ جواب دینے سے محروم ہو چکا ہے کبھی مرحوم کی مفروضہ کمزوریوں کو اللہ کے سپرد کرنا کہ وہ بخش دے اور خود اس کی سیرت و شخصیت کو مجروح و مسخ کرنے کے لیے مسلسل نیش زنی اور زہر چکانی کرتے رہنا اور اس سے حظ اٹھانا جس دماغی فتور اور نفسیاتی ناگفتنی کی علامت ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ مفاسد و مکائد کا یہ طائفہ اس درجہ نامبارک نہ ہوتا تو اس سے دور رہنے کو غالب نے ایسے انسانی الہامی انداز میں نہ کہا ہوتا ؎

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند　　حق را بسجودے و نبی را بدرودے!

علمائے سلف کے مقرر کیے ہوئے آئین وضوابط کے خطوط پر ذاکر صاحب نے مذہب کو قرینِ علم وحکمت ثابت کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ وہ مذہب کے اوامر ونواہی کو زندگی میں برت کر مذہب کو قرینِ ثواب جاننے اور جتانے کے قائل تھے۔ حالت نزع میں مریض سے قریب اقربا و احباب، کو کلام پاک اور کلمہ طیبہ پڑھنے کی جو ہدایت کی گئی ہے، ذاکر صاحب نے اسے اپنی زندگی میں سرمایۂ تسکین وطمانیت بنا لیا تھا۔ وفات کے بعد جب تک میت سپردِ خاک نہیں کر دی گئی اور اس کے دنوں بعد تک خدا کے لاتعداد بندے ایصالِ ثواب کے لیے کلام پاک کی تلاوت کرتے رہے؛ گذشتہ چند صدیوں میں یہ شرف ایک دو ہی مسلمانوں کو نصیب ہوا ہوگا۔ اس سے ذاکر صاحب کی روح کو جو جسم کی ارضی وعارضی ربط سے رہا ہو کر یوم الحساب تک آسودۂ رحمت رہے گی اس کو کتنی تسکین، تطہیر وترفع حاصل ہوا ہوگا، ہر مسلمان اس کا اندازہ کر سکتا ہے۔

ذاکر صاحب ایک بار شدید انفلوئنزا میں مبتلا ہوئے۔ یہ دونوں پھیپھڑے ماؤف اور ٹمپریچر ۱۰۴۔ لیکن زبان سے بے اختیاری میں بھی کوئی کلمہ بیزاری، مایوسی یا تکلیف کا نہیں نکلتا تھا۔ چاہا کہ اس موقع پر وہ کلمات کہوں یا انداز اختیار کروں جو پہلے سے مقدر ہیں لیکن انہوں نے اپنی تکلیف کا نہیں میری دلچسپی کی باتوں کا ایسے ہموار اور اپنے مخصوص دلکش انداز میں ذکر چھیڑ دیا جو ان ہی کا حصہ تھا۔ فرمایا آج رات دونوں[1]

---

[1] یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب ذاکر صاحب جب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ میری سب سے چھوٹی لڑکی کی شادی ہوئی تھی۔ ذاکر صاحب نے لڑکی، اس کے شوہر اور بقیہ گھر والوں کو رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ کچھ دنوں بعد (بقیہ حاشیہ آئندہ)

کھانے پر آرہے ہیں نہ؟ میں نے کہا یہی کہنے آیا تھا کہ آپ کی طبیعت اتنی خراب ہے، یہ تقریب اور دن کے لیے کیوں نہ ملتوی کر دیجیے۔ بولے نہیں نہیں۔ میرے بیمار ہو جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان سبھوں کی موجودگی میں تکلیف کی طرف دھیان کم جائے گا۔ چنانچہ پروگرام کے مطابق ڈنر ہوا۔ کھانے کی میز پر سب بیٹھ گئے اور کھانا شروع ہوا تو ذاکر صاحب نے اپنے سونے کے کمرے اور ڈائننگ روم کے درمیان حائل پردے کو ہٹوا دیا اور اپنی چارپائی کھانے کے کمرے کے سامنے کرالی۔ لیٹے لیٹے ہاتھوں کے اشارے اور متبسم چہرے سے اپنی خوشی اور شفقت کی پھوہاریں بکھیرتے رہے۔ کبھی کبھی دو ایک فقرے خوش طبعی کے اس لطف سے کہہ دیتے کہ فضا لہک جاتی اور مہمان نہال ہو جاتے۔ کھانا ختم ہو جانے کے بعد جب تک مہمان رخصت نہیں ہو گئے ان کے اس اندازِ دلنوازی سے سب سرفراز و شادکام ہوتے رہے جس تکلیف اور خطرے میں وہ مبتلا تھے، ڈاکٹروں کی جیسی ممانعت تھی اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

لڑکی کا انتقال ہو گیا اس حادثے کو گزرے دس بارہ سال ہو گئے لیکن اس نے مجھ سے وہ سب کچھ چھین لیا جن سے میں عبارت تھا اور جن کو حاصلِ حیات جانتا تھا۔ احباب اور اعزا جو میرے اس حال سے واقف ہیں وہ اس حادثے اور مرحومہ کا ذکر اشارۃً بھی میرے سامنے نہیں کرتے۔ اب جو کرتا رہتا ہوں وہ اس مجبوری اور ڈر کی بنا پر ہوتا ہے کہ اپنے اور پرائے لعنت نہ بھیجنے لگیں کہ نفس کے سارے مطالبات تو پورے کرتا ہے صرف کام نہیں کرتا۔ کیسی بے بسی اور اس سے بڑی ہوئی بے اختیاری ہے کہ اس وقت اس سانحے کے ذکر سے نہ باز رہتے بن پڑتا ہے نہ بیان کرنے کی ہمت ہوتی ہے۔ فانی کا یہ شعر فانی ہی کی زبان سے سنا ہے لیکن اس وقت وہ اثر نہیں ہوا تھا جو اب ہے:

جگ سونا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہوا دنیا جب بھی بستی تھی دنیا اب بھی بستی ہے!

خیال ہے کہ یہ شعر میری حالت کو پہنچ کر فانی نے نہ کہا ہو گا اب دعا ہے کہ کوئی دوسرا وہیں پہنچ کر اسے پڑھنے پر مجبور نہ ہو!

رات جتنی گزر چکی تھی اس میں ذاکر صاحب کی یہ دوست داری اور نوازش اس وقت جس طرح یاد آ رہی ہے اور جن بدلے ہوئے اور پھر کبھی نہ بدلنے والے حالات میں آ رہی ہے، کیا بتاؤں اس وقت اس نے دل کا کیا حال کر دیا ہے۔

وائس پریسیڈنٹ شپ کے زمانے میں ایک بار زیادہ بیمار ہو گئے تھے۔ دو ہی ایک دن بعد یوم جمہوریہ کی تقریب تھی۔ صدر جمہوریہ خود علیل ہونے کے سبب سے تقریب میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ ایک سلسلے میں دہلی جانا ہوا۔ ذاکر صاحب کو غیر معمولی حد تک کمزور پایا لیکن مسکرا کر پذیرائی اس طور پر کی جیسے وہ نہیں میں بیمار اور تشفی و دل آسائی کا مستحق تھا فرمایا۔ ڈاکٹروں نے چند طبعی تقاضوں کو پورا کرنے کے علاوہ دوسرے تمام شریفانہ تقاضے ممنوع قرار دے دیے ہیں۔ عرض کیا اس حال میں یوم جمہوریہ کے طرح طرح کے آداب پورے کیے جا سکیں گے۔ جلوس کے مقررہ ضوابط کے ساتھ مسافت فوجی طریقے پر دیر تک کھڑے رہ کر سلامی لیتے اور دیتے رہنا تندرست آدمی کے لیے بھی مشکل ہے چہ جائیکہ آپ جس کی توانائی کا یہ عالم ہو۔ بولے ٹھیک ہے، لیکن حکومت نے اتنے دنوں تک اعلیٰ سے اعلیٰ معیار کے مطابق مجھ سے جو سلوک کیا ہے وہ اس مقصد کے پیش نظر کیا ہے کہ صدر جب کبھی علیل ہوں یا کوئی اور اتفاق آن پڑے تو نائب صدر کی حیثیت سے ان کی ذمہ داری کو پورا کرنا میرا اولین فرض ہو گا۔ موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے میں نے موضوع گفتگو بدلنے کی کوشش کی اور کہا آپ کا فرمانا درست لیکن جانا اتنا درست نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ واقعہ سخت ہو تو میں جان کو ہمیشہ عزیز رکھنے والوں میں رہا، اپنی ہی جان کو نہیں دوسروں کی بھی جان کو! ہنس پڑے پھر مدارات کا پروگرام شروع ہو گیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔ تھوڑی

دیر بعد رخصت ہو کر علی گڑھ واپس آ گیا۔ لیکن یہ تشویش برابر پیچھا کرتی رہی کہ موقع اتنا اہم، صحت کا یہ حال، پروگرام اتنا صبر آزما۔ خدا اپنا فضل رکھے تقریب کی روئداد ریڈیو پر سنی۔ اخبار میں تصویر دیکھی تو ذاکر صاحب کو حسبِ حال ذاکر صاحب ہی پایا۔ جیسے نہ بیمار تھے نہ کمزور نہ کچھ اور۔ نہایت اعتماد و وقار کے ساتھ تیر کی مانند سیدھے کھڑے ہوئے سلامی لے رہے تھے میرے لیے یہ تعجب کی بات نہ تھی لیکن خوشی کی بہت زیادہ رہی ہے۔ اندیشہ یا آزمایش کا موقع آن پڑتا تو ذاکر صاحب کی کچھ باطنی طاقتیں بیدار ہو جاتیں اس لیے کہ ایسے مواقع پر اور یوں بھی میں نے ان کو مطلق کسی تردد یا تذبذب میں مبتلا نہ پایا۔ ان کو کسی اعلیٰ قوت پر کامل یقین تھا جس سے وہ ہر حال میں خیر و فلاح کی امید رکھتے تھے اور میں نے تو کچھ ایسا ہی دیکھا کہ ایک اعلیٰ قوت نے ذاکر صاحب کی ہمیشہ مدد کی۔ کرائسس کتنا ہی سنگین ہوتا ذاکر صاحب اس کا سامنا کھلے میدان، انتہائی امید و اعتماد کے ساتھ کرتے۔

مسلمان ہوں لیکن ایسا نہیں جس کی تقلید کی جائے۔ اسلام کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی بہت کم توفیق ہوئی۔ اس کے باوجود مسلمان ہونے کو بڑا شرف اور ذمہ داری سمجھتا ہوں۔ خدا اور اس کے بندے دونوں کی طرف سے۔ اس سے اپنی ذہنی صلاحیتوں اور آرزو و عمل کو ہمہ وقت پرکھتے رہنے میں بڑی مدد ملی ہے۔ اس نے اعلیٰ اور عظیم کا احساس دیا۔ اعلیٰ اور عظیم تک رسائی نہیں ہوئی لیکن ان کو کبھی اپنی پہنچ سے باہر نہیں سمجھا۔ مجھے عبادت پیشہ مسلمان زیادہ ملے۔ عبادت شناس اور عبادت گزار بہت کم۔ عبادت کا مفہوم یا مقصد یہ نہیں کہ خدا سے مزدوری، خیرات، انعام، تاوان وصول

کرنے یا دوسروں پر فضیلت اور تفوق جتانے یا ان کو سنگسار کرنے کا حق اور اختیار حاصل ہو گیا ہو۔ ہر پندار بدمذاقی ہے۔ لیکن عبادت کا پندار لعنت ہے۔ ایسی عبادت کی سزا مقرر ہے جو گناہ کی سزا سے زیادہ سخت اور عبرت انگیز ہو تو عجب نہیں۔ عبادت پیشہ عبادت کو وقتی فریضہ سمجھتا ہے حالانکہ عبادت ہمہ وقتی وظیفہ ہے، زندگی کے ہر شعوری فعل میں جاری و ساری۔ اس عبادت سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں ہے۔ عبادت زندگی کو قبول کرنے کا اقرار و اقبال اور سعیِ عمل ہے۔ عبادت پیشہ اور عبادت گزار کا فرق یہ ہے کہ اول الذکر اپنی عبادت اور اپنے احسانات سے ہر وقت ہر کس و ناکس کو مطلع کرتا رہے گا۔ جیسے ان کو چیلنج دے رہا ہو۔ عبادت گزار اپنی خدمات کو نہ کبھی ظاہر کرے گا نہ ظاہر ہونے دے گا بلکہ اس پر شرمندہ رہے گا اور شکر گزار کہ خدا کی دی ہوئی زندگی جیسی نعمت اور سرفرازی کے مقابلے میں اس کی خدمات کتنی ناچیز ہیں۔ اگر اللہ تعالےٰ اور اس کے بندوں نے اسے قبول کر لیا تو اس کے لیے کتنا بڑا شرف ہے۔ خدا کی صفات کو جانتے اور مانتے ہوئے اس کو دھوکا دینے کی کوشش ایسی حماقت ہے جسکے ارتکاب کی ایک عبادت پیشہ ہی جرأت کر سکتا ہے۔

یہ جو بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالےٰ انہی گناہوں کو معاف کرے گا جو حق اللہ کے ادا کرنے میں غفلت سے سرزد ہوئے ہوں گے، دوسری طرف حق العباد کو پورا کرنے میں جو تقصیر ہوتی ہو گی اس کو اپنی طرف سے معاف نہ کرے گا بلکہ معاف کرنے کا تمام تر حق یا اختیار اس کا ہو گا جس کی حق تلفی کی گئی ہو گی۔ مجھے نہیں معلوم اسلام کے خدا کے علاوہ دوسرے مذاہب کے خداؤں نے بھی یہ حق اپنے اپنے بندوں کو دیا ہے یا نہیں اس سے ان لوگوں کو متنبہ اور رہنا چاہیے جو اللہ کی عبادت کی خانہ پری کر کے اس کے بندوں کو اپنی طاقتِ ہوس یا کینہ کا شکار

بناتے ہیں۔ اللہ کی حکومت کو وہ ان زمین داروں کے تسلّط کی مانند سمجھتے ہیں جو محصل یا اجارہ دار سے مقررہ رقم وصول کر کے اپنی رعایا کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے کہ جو چاہیں سلوک کریں اس سلسلہ میں شفیع المذنبین کے درجے کو بھی نظر میں رکھنا چاہیئے۔ شفاعت کا نکتہ اس میں پوشیدہ ہے کہ خدا نے انسان کی شفاعت انسان ہی کے ہاتھ میں ہی نہیں تو انسان کے بھی ہاتھ میں کچھ رکھی ہے۔ اور انسان کا ارفع و اقدس نمونہ و نمائندہ حضور صلعم ہیں۔ یہ بات مشکل سے تصوّر میں آسکتی ہے کہ حضورِ اکرم خدا سے اس شخص کی شفاعت فرمائیں گے جس نے ساتھی انسانوں کا حق چھینا اور ان پر ظلم کیا ہو گا۔ ظالم کو سزا خدا دے گا یا دنیا کا مقررہ قانون اور عدالت۔ ظالم کو معاف صرف مظلوم کر سکتا ہے۔ یہ بات اس لیے عرض کرنی پڑی کہ عبادت پیشہ حضرات عبادت پر زیادہ بھروسہ نہ فرمائیں۔ خلق کی خدمت و خیر خواہی سے خالی ہے تو ایسی عبادت وادیِ غیر ذی زرع ہے۔ جہاں نہ پانی ہے نہ پودا نہ پڑول!

گفتگو طویل ہو گئی۔ بظاہر بے محل بھی لیکن ذاکر صاحب کے کردار اور شخصیت کو اس بیان کی روشنی میں پرکھنے سے یہ معلوم کرنے میں مدد ملے گی کہ مذہب جو سرچشمہ ہوتا ہے، ایمان، عقیدہ، عبادت اور خدمت کا، اس کا ذاکر صاحب کا تصور کتنا بلند تھا اور کس طرح انہوں نے اپنی زندگی کے معمولات کو ان معظمات سے مستحکم و مزین کیا تھا۔ ذاکر صاحب جہاں ہوتے صدر انجمن ہوتے۔ شکل و شمائل، ذہن و ذکاوت، شفقت و شائستگی، حفظِ مراتب، تہذیبِ اخلاق کی گراں مائگی اور فکر و فن میں بصیرت کے اعتبار سے اقدارِ عالیہ کی عظمت، اور فنونِ لطیفہ کی اہمیت کا براہِ راست تذکرہ ذاکر صاحب کی

کی گفتگو میں معمولاً فلسفہ وحکمت کے دقائق، شعر وادب کی عبارت و اشارت یا حکماء اور ائمہ کے اقوال میں نہیں ہوتا تھا۔ وہ مجرد اقوال یا نظریات کا شاید ہی حوالہ دیتے۔ ایسے مواقع اور موضوع پر وہ بالعموم بڑے اچھے لوگوں کے اعمالِ صالح اور نفسِ انسان کی سعادت و شرافت کو اس انداز و احترام سے پیش کرتے جیسے ان اچھے اور بڑے لوگوں کو ان کے حسنات کے ساتھ ہم ذاکر صاحب میں سُن، دیکھ یا چھو رہے ہوں۔ وہ ہر مذہب و مسلک کی اعلیٰ اور عظیم شخصیتوں کا حوالہ دیتے۔ انھوں نے خدمت کو عبادت اور عبادت کو خدمت کا درجہ دے دیا تھا اور دونوں کو حسن بینی اور حسن آفرینی کا وسیلہ بنا دیا تھا۔

ذاکر صاحب کسی کے کام کی تعریف خواہ وہ عالم ہو یا عامی نہ بندھے ٹکے الفاظ میں کرتے تھے نہ دیرنگ اور زیادہ سے زیادہ الفاظ میں کرتے لیکن دو ہی ایک فقرے میں ایسی دلنوازی اور بالغ نظری سے کر دیتے کہ مصنّف کو اس کی ساری محنت و محنت کا صلہ مل جاتا۔ اوروں کی مانند وہ کبھی ایسا انداز اختیار نہ کرتے جس سے اکثر اپنی بڑائی مقصود ہوتی ہے، مصنف کی دلجوئی یا ہمّت افزائی نہیں۔ ان کی وفات پر ایک برطانوی ہائی کمشنر اور دانشور نے کہا تھا کہ ذاکر صاحب کو دنیا کے کتنے زیادہ شعر و ادب سے واقفیت تھی کم کسی کو اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایک انگریز کا جو کسی کی تعریف کرنے میں تمام دوسری قوموں سے زیادہ محتاط اور کفایت شعار ہوتا ہے، یہ رائے رکھنا معمولی بات نہیں ہے۔ اس نے ذاکر صاحب سے وقتاً فوقتاً علوم و فنون پر تبادلۂ خیال کرنے کے بعد ہی یہ رائے قائم کی ہوگی۔ اور تو نہیں اردو مطبوعات کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ شاید ہی کوئی ایسی کتاب شائع

ہوتی جو ذاکر صاحب کے یہاں نہ پہنچ جاتی۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ حیرت اس پر ہے کہ وہ سب ان کے مطالعہ سے گزرتیں اور ہر ایک کے بارے میں رائے قائم کر چکے ہوتے اور کیسی رائے جو صرف ذاکر صاحب ہی کا حصّہ ہوتی۔ شب خوابی کے کمرے سے ملحق کمرے میں ایک لمبی چوڑی میز پر ان مطبوعات کا انبار ہوتا۔ ایک بار میں ساتھ تھا۔ میز کے قریب سے گزرے تو کچھ مطبوعات اٹھالیں۔ پوچھا ان کو پڑھا ہے۔ میں نے کہا نہیں۔ وہیں ایک کتاب ایسی دکھائی دی جو میری نظر سے گزر چکی تھی۔ معلوم نہیں کیوں اور کیسے زبان سے نکل گیا، یہ کتاب بھی ملاحظہ سے گزری ہے۔ فرمایا۔ ہاں۔ پھر اس پر اپنے خیالات کا اظہار ایسے فی البدیہہ، ترشے اور تلے ہوئے فقرے میں کیا جو صرف ذاکر صاحب کا حصّہ تھا! شاید بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ مصوری، شاعری اور تنقید کے جدید ترین معیار و موقف، ہیئت و مواد و اظہار و ابلاغ نیز ان کے معروف ترین دانشوروں کے افکار کا ذاکر صاحب کو کتنا واضح علم تھا! بات دراصل وہی تھی جس کا اظہار ان کی وفات پر ایک مقتدر کمیونسٹ ممبر پارلیمنٹ نے کیا تھا کہ ذاکر صاحب اپوزیشن کے تحفظ کو بھی پورے طور پر ملحوظ رکھتے تھے اور کیسے معتبر محافظ! ذاکر صاحب کے یہاں قدیم اور جدید جدا جدا خانوں میں نہیں بٹے ہوئے تھے بلکہ دونوں کے کسر و انکسار کا حاصل ملتا تھا۔ جو ذاکر صاحب کے تصرف سے ایک نئے اور ترقی پذیر معیار کا پیام ہوتا اور نشاندہی کرتا۔ یہی وہ باتیں تھیں جن کے سبب سے ذاکر صاحب کبھی آؤٹ آف ڈیٹ نہ ہو سکے اور آؤٹ آف ڈیٹ نہ ہونے کا امتیاز و اختیار ہر شخص کے حصّے میں نہیں آتا!

آئمہ کے ملفوظات کے مطالعے کا موقع ملا ہے۔ وہ جن امور کی تلقین کرتے

ہیں ان میں شک وشبہ کی گنجایش نہیں۔ لیکن زمانے کے بدل جانے اور جلد جلد بدلتے رہنے سے انسان کے فکر و عمل کو متاثر کرنے کے طریقے اور عوامل بھی وہ نہیں رہے جو پہلے کبھی موثر اور مقبول تھے۔ اب تشبیہ، استعارہ، تمثیل، اشارہ، کنایہ اور کشف و کرامات کے حوالے اور جنت دوزخ کا ذکر عام لوگوں کو بھی اتنا متاثر نہیں کر پاتے جتنا پہلے کرتے تھے۔ اس لیے کہ ہر طرح کے علوم، معلومات، مشاہدات و تجربات عام ہو گئے ہیں۔ ہر شخص ہمہ وقت ان کی قدر و قیمت جانتا رہتا ہے۔ سائنس اور میکانکی امور سے قطع نظر جہاں اعتقاد و اخلاق کو زیادہ دخل نہیں، مذہب اور اخلاق اہمیت و افادیت کا تمام تر دارومدار شخص کے صالح و صحت مند کردار پر ہے یعنی وہ خارج کے عناصر و عوامل پر نہیں بلکہ باطن کے ان واردات اور احوال پر کیسی نظر اور کتنی گرفت رکھتا ہے جو خارج پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ تسخیر فطرت انسان کا جتنا قابلِ فخر کارنامہ ہے۔ اتنا ہی اپنے پر تسخیر پانے میں ناکامی اس کا المیہ ہے۔ امریکہ نے چاند پر پاؤں رکھ دیا لیکن کالے پر اس کا پاؤں جہاں کا تہاں ہے! انسانیت فاتحِ عالم کی منتظر کبھی نہیں رہی، رحمتِ عالم کے لیے ہمیشہ چشم براہ رہے گی!

ذاکر صاحب میں وہ تمام صفات موجود تھیں جو کسی درماندہ، متشکک یا برہم و بیزار کو طمانیتِ خاطر سے بہرہ اندوز کر سکتی تھیں۔ وہ آرٹ اور علوم پر وسیع اور گہری نظر رکھتے تھے، سیرت کی بلندی، پختگی اور پاکیزگی کے لحاظ سے معتبر و محبوب تھے۔ ان میں مذہب کا جو خصوصی احترام ملتا تھا وہ کچھ تو خاندان سے ورثہ میں آیا تھا، کچھ بزرگوں کے فیض سے اور بہت کچھ انہوں نے اپنے کو تربیت دے کر حاصل کیا تھا۔ اس تربیت نفس کے

لیے انہوں نے کتنا ریاض کیا ہوگا اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو نہ صرف اس منزل سے گزرے ہیں بلکہ مسلسل گزرتے رہتے ہیں۔ وہ صوفی اور آرٹسٹ دونوں تھے، اسکالر بھی تھے عارف بھی۔ بقول ڈاکٹر سیّد عابد حسین ان میں اقبال کے مردِ مومن اور گاندھی کے مردِ حق کی شان ملتی تھی۔ یہ وہ صفات ہیں جو معلم کو پیغمبر کے قریب کرتی اور رکھتی ہیں۔ ہر مصلح یا مصلحِ اعظم بنیادی طور پر معلم اور ہر معلم امکانی اعتبار سے مصلح یا مصلحِ اعظم ہوتا ہے، اس ایک فرق کے ساتھ کہ رسول اور پیغمبر خدا کی طرف سے مامور ہوتا ہے اور معلم اس کے بندوں کا منتخب کردہ ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب مزاج، فن اور فکر کے اعتبار سے معلم تھے۔ وہ ہر دیار و دربار کے لیے متفقہ طور پر اخلاق و انسانیت، صلح و سلامتی، آرٹ، ادب اور تہذیب کے سفیرِ اعظم منتخب کیے جا سکتے تھے ان کے ہاتھ میں اقدار و اشخاص ہی نہیں ملکوں اور ملتوں کے ناموس محفوظ تھے!

سیاست سے مجھے دلچسپی نہیں۔ جس مشغلے میں فریقین ایک دوسرے کا اعتبار کرنے سے ڈرتے ہوں اس میں حصہ لینا میری جیسی واجبی عقل و ہمت والے کے لیے نہ ممکن تھا نہ مناسب۔ مذہب اور اعتقاد کے بارے میں بھی تجسس کی جرأت نہ ہوئی اس لیے کہ دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ مذہب دیے ہوئے اعتقاد و احکام میں تفتیش و تفحص کے معنی، استثناء کی اتنی گنجائش رکھتے ہوئے جتنی عموماً رکھی جاتی ہے، بدنیتی کے ہیں۔ یعنی مذہب و اعتقاد میں کرید بالعموم اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب دل میں اوامر سے گریز اور نواہی کا مرتکب ہونے کے لیے چور دروازوں کی تلاش کرنے اور پانے کی خواہش سر اٹھاتی ہے۔ اس قماش کے لوگ ہر جگہ نظر آئیں گے۔ ذاکر صاحب سے ان موضوعات پر گفتگو کرنے کا کبھی موقع مل جاتا تو محسوس ہوتا کہ سیاست اور

مذہب پر ایمانداری کے ساتھ یکجا سوچنے سے جو بصیرت حاصل ہوتی ہے وہ بڑا دل افروز اور اخلاقی تجربہ ہوتا ہے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ ہر طرف سے منہ موڑ کر اور سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے کسی مسئلہ بالخصوص سیاست اور مذہب پر سوچنے سے نتیجہ اکثر غلط اندیشی اور غلط روی ہوا ہے۔

ذاکر صاحب کو معلوم نہیں کب اور کیسے اتنا موقع مل جاتا کہ وہ ضروری اور مفید معلومات جلد سے جلد فراہم کر لیتے اور ان کو برمحل کام میں لاتے تھے جیسے یہ معلومات ان کے ذہن میں از خود جاگزیں ہوتی رہتی ہوں اور وہ بھی اتنی جتنی کہ کارآمد ہوں۔ اتنا مرتب اور حشو و زوائد سے کلیتہً پاک ذہن دیکھنے میں کم آیا ہے۔ کیسی عمیں یاد طالب علمی کے دنوں کی اس وقت ذہن میں آ رہی ہے تمام دن کبھی کبھی رات گئے تک یونین کلب، کالج کی لائبریری، احباب کے کمروں اور معلوم نہیں کہاں کہاں کا چکر لگاتے ہوئے کسی وقت نمودار ہو جاتے، گنگناتے، مسکراتے، شاداب و شادماں جیسے اپنے ہی سے نہیں ساری دنیا سے مطمئن و مسرور ہوں۔ سب یک زبان ہو کر پوچھتے ذاکر صاحب کہاں رہے حسب معمول کیسے تفریحی اور گدگدانے والے انداز میں جس میں ذہانت و ذکاوت کی بڑی دلکش جھلک ملتی ہے کہتے "معلومات فراہم کرتا رہا۔" اب کیا بتاؤں کہ اس زمانے میں "معلومات فراہم" کرنے کا فقرہ کیسے کیسے دلچسپ مفہوم میں استعمال ہوتا تھا۔ علم و فنون سے قطع نظر، اشخاص و احوال سے بھی ان کی واقفیت کتنی حیرت انگیز تھی! کبھی کبھی ان پر گفتگو کرنے کا موقع آ جاتا۔ بعض نزاکتوں کا لحاظ کرتے ہوئے اس کی طرف تامل و تذبذب سے اشارہ کرتا تو مسکراتے اور کس مزے سے کہتے۔ نہیں نہیں کہہ ڈالیے۔ پھر طالب علمی کے زمانے کا فقرہ "معلومات میں اضافہ ہوگا" دہرا کر ہنس پڑتے ریک لخت

ایسا محسوس ہونے لگتا۔ جیسے ۵۰۔ ۶۰ برس پہلے کے کالج کے شب و روز، بام و در، ہائے و ہو اور اخلاص و اعتبار کے دریچے کھل گئے ہوں۔ دلجوئی و ہمدردی کا اس طرح اظہار کرنے والا اب کہاں ملے گا۔ کہنا ختم کر لیتا تو اپنی رائے کا اظہار کرتے۔ اُس وقت معلوم ہوتا کہ صورتِ حال واقعتہً کیا تھی۔ کتنی ایسی باتیں ہوتیں جن کا مجھے یا تو علم نہ ہوتا یا غلط علم ہوتا۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ ذاکر صاحب کی معلومات شاید ہی کبھی نامکمل یا غلط ہوتیں یا وہ کبھی کسی غلط فہمی میں مبتلا پائے گئے ہوں!

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ذاکر صاحب سیاسی آدمی نہ تھے۔ اس اعتبار سے یقیناً نہ تھے کہ ان کی کوئی پارٹی ہوتی جس کا کوئی سیاسی مقصد یا موقف ہوتا اور اس پارٹی کے وہ باضابطہ لیڈر یا پیرو ہوتے۔ ذاکر صاحب عملی سیاست سے بلند و برتر رہے لیکن انہوں نے سیاسی شخصیتوں اور سیاسی اسالیبِ فکر کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ حکومت کے اعلیٰ مناصب پر رہے۔ اپنی دانشمندی، منصفی، ہمدردی اور وسیع النظری سے سیاست کی ساحری اور شاطری کو حتی الوسع حدود سے آگے بڑھنے نہیں دیا۔ منصب کی پابندی اور سیاست کی غیر ذمہ داری کو انہوں نے جام و سندان باختن کے معیار تک پہنچا دیا تھا۔ جن اعلیٰ عہدوں کی ذمہ داری انہوں نے سنبھالی اس کے غیر تحریر شدہ قانون اور روایت یہی تھی جس کو ذاکر صاحب نے قائم ہی نہیں رکھا بلکہ اس کو مزید اہمیت و حریت بخشی۔ جامعہ ملیہ کی پہلی جوبلی کے موقع پر ذاکر صاحب نے عملی سیاست کے مختلف نہیں بلکہ متضاد اندازِ فکر و عمل کے دو ممتاز ترین سربراہوں کو جیسے خونیں و آتشیں دور میں جامعہ کے پلیٹ فارم پر اکٹھا کر لیا تھا وہ اس زمانے میں کسی اور کے بس کی بات نہ تھی

یاد آتا ہے کہ پس منظر کی گفتگو ایک موقع پر ناکام ہوتی نظر آنے لگی تھی ہز ہائینس نواب حمید اللہ خاں (بھوپال) بیچ میں پڑے تھے اور گفت و شنید کے آگے بڑھنے کا امکان پیدا ہو گیا۔ اس وقت یہ نواب صاحب کا کارنامہ سمجھا گیا۔ لیکن خود نواب صاحب کو اس مہم میں ذاکر صاحب سے کتنی قیمتی رہنمائی اور تائید حاصل ہوئی تھی اس کا علم بہت کم لوگوں کو ہے!

تقسیم ملک کے بعد سے تاریخ وفات تک انہوں نے وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، گورنر بہار، نائب صدر اور صدر جمہوریہ ہند کے فرائض انجام دیے۔ مسلم یونیورسٹی اس حالت کو پہنچ گئی تھی کہ خود یہاں کے سربرآوردہ حضرات میں سے ایک نے چیف منسٹر یو۔ پی کو آفر دیا تھا کہ وہ اس یونیورسٹی کو کلیتہً حکومت کے تصرف میں لے لیں۔ دہلی کے بعض نیم سرکاری اکابر کی طرف سے یہ پیش کش عام تھی کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، حکومت ہند کے حوالے کر دی جائے۔ اس کے بدلے پنجاب کی کوئی درسگاہ پاکستان کو الاٹ کر دی جائے۔ ان دنوں یونیورسٹی کے بہی خواہ کس درجہ مایوس و مضطرب تھے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ باہر کا ہر ایرا غیرا، صبح و شام یہاں آکر جو کچھ جی میں آتا اور ظاہر ہے جی میں کیا کیا آتا ہوگا، ہم کو سنا جاتا۔ جس کو کہیں پلیٹ فارم یا سامعین نہ ملتے وہ سیدھا علی گڑھ کا رخ کرتا اس لیے کہ یہیں سے اس کی ناسزا گفتاری اس کے لیے موجب خیر و برکت ہوتی۔ تاریکی اور تہلکے کے اس عالم میں جب اپنے غیر اور غیر اپنے معلوم ہونے لگے تھے، ذاکر صاحب بھی تشریف لائے۔ اس کے بعد پھر کسی شخص کی مجال نہ تھی کہ علی گڑھ ہی میں نہیں کسی بھی پلیٹ فارم سے ہمارے بارے میں کوئی ناسزا کلمہ کہنے کی جرأت کر سکتا۔ پھر جس دلسوزی، دانشمندی اور حوصلہ و ہمت

سے انھوں نے اس ادارہ کو اس سیاسی جبر و قہر سے نجات دلائی جن سے وہ دوچار تھا۔ اس کو کون نہیں جانتا۔ ذاکر صاحب نے رفتہ رفتہ یونیورسٹی میں اطمینان، آسودگی، امن اور امید کی ایسی فضا پیدا کر دی جیسے اس سے پہلے یونیورسٹی ہی پر نہیں سارے ملک پر کوئی حادثہ نہیں گزرا تھا۔ ان کے چلے جانے کے بعد یونیورسٹی کیسے کیسے نرغے میں آئی۔ کیا کیا نہ ہوا، کہاں پہنچی اور ایک بار پھر اس کے بہی خواہ اس کے مستقبل کی طرف سے کتنے بددل یا بے قرار رہنے لگے ہیں وہ بھی کوئی راز نہیں ہے!

علی گڑھ سے رخصت ہو کر بہار کے گورنر ہوئے۔ اس زمانے میں بہار کے شرفا، اہلِ علم اور دوسرے دانشوروں سے جو حالات سننے میں آئے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب وہاں کتنے محبوب و مقبول تھے۔ جس طرح کسی جگہ کا پھل یا شیرینی مشہور ہو اور وہاں سے گزرنے والے ان کو خرید کر عزیزوں اور دوستوں کے لیے نہایت شوق سے بطور تحفہ لے جاتے ہوں اسی طرح ان دنوں جو شخص بہار سے آتا وہ ہم سب کو ذاکر صاحب کی شرافت، قابلیت اور منزلت کے قصے سناتا۔ ان دنوں فکر و فن کے اکابر کی سب سے زیادہ مان دان گورنر ہاؤس میں تھی۔ طالب علموں کو ذاکر صاحب کے سایۂ شفقت میں اپنی سیرت و شخصیت کو سدھارنے سنوارنے کا شوق پیدا ہوتا۔ ان کی دشواریوں کو دور کرنے کے لیے ممکن و مناسب تدبیریں عمل میں لائی جاتیں۔ بہار کی اچھی قیمتی اور تاریخی یادگاروں کو محفوظ کرانے کے انتظامات کیے گئے۔ بہار کے احباب بتاتے تھے کہ جہاں تک علم و فن کی سرپرستی اور عالموں کی قدر افزائی کا تعلق تھا، بہار میں ذاکر صاحب کی گورنری امرائے پیشیں کے عہد کی یاد تازہ کرتی تھی۔

سیاست کے بیوہار اور بازار ہیں، جنس اور نرخ کو بیوپاری جس جس طرح پلٹے دیتے اور خود پلٹے کھاتے رہتے ہیں۔ ان سے واقف بھی ہوں نفوذ بھی۔ ان بیوپاریوں کے ہاتھ اور دیدے کی صفائی کس نے نہ دیکھی ہوگی ذاکر صاحب جب تک بہار کے گورنر رہے وہاں کی سیاسی پارٹیوں کی ہر سطح پر ہر طرح کے جوڑ توڑ اور اتار چڑھاؤ دیکھتے رہے اور ان کو اس طرح نظر میں رکھا کہ کسی فرد یا جماعت کو کھل کھیلنے کی جراءت نہیں ہوئی۔ ذاکر صاحب کا یہ اثر منصبی ہرگز نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ یہ صرف ان کی ہر داغ سے پاک اور ہر برتری سے آراستہ و محکم شخصیت تھی جس کے سامنے کسی نالائقی کو سر اٹھانے کی ہمت نہ ہوتی تھی اور بہار کی سیاسی ہوا کو باوجود ہر طرح کی ناسازگاریوں کے صحت مند نہیں تو اعتدال پر قابو میں رکھ سکی شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ سیاسی مناقشوں کے سبب سے اکثر صوبوں میں گورنر حکومت کی نوبت آتی رہتی ہے لیکن ذاکر صاحب جب تک بہار کے گورنر رہے وہاں کی وزارت یا پارٹی کے توازن میں کوئی قابلِ لحاظ انتشار یا اختلال رونما نہیں ہوا۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی اس لیے کہ گورنری سے سبکدوش ہو کر نائب صدر کے فرائض سنبھالنے دہلی آگئے تو کچھ ہی دنوں بعد بہار کی وزارتی حکومت اس طرح زیر و زبر ہونے لگی اور ایسی ایسی ناشدنی اور ناگفتنی منظر عام پر آئیں کہ تعجب ہوتا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب نے کیسے مزبلے پر قدم جما رکھے تھے کہ قدم اٹھاتے ہی ایسا معلوم ہونے لگا جیسے آگ ہی اگلنے والے پہاڑ نہیں ہوتے، گراوٹ اور گندگی اگلنے والے پہاڑ بھی ہوتے ہیں!

پنڈت جواہر لال نہرو کی وفات پر اپنے ایک مضمون میں عرض کیا تھا

کہ دہلی اتنا بڑا اور بے قابو شہر ہو گیا ہے اور اس میں ایسے ایسے غیر متوقع حالات حادثات ہر وقت پیش آتے رہتے ہیں کہ وہاں جانے میں خاصا پس و پیش ہوتا ہے جیسے کسی ڈراؤنے بے کراں جنگل میں گم ہو گیا ہوں جہانِ حال کوئی نہیں، جان و مال آبرو سب خطرے میں! لیکن اس وقت حکومت کے اعلیٰ ترین مناصب پر فائز تین ایسی عظیم ہستیاں تھیں جن کے ہوتے ہوئے دل کو ڈھارس رہتی تھی کہ کوئی حادثہ پیش نہ آئے گا۔ دوسرے یہ کہ اس وقت دنیا کی زیادہ سے زیادہ ترقی یافتہ اور طاقتور حکومت یا ملک کی عنان بھی ایسے بے داغ بے لوث اور معتبر ہاتھوں میں نہ تھی جیسی کہ جمہوریہ ہند کے ان اکابر کے ہاتھوں میں جیسے کہ ڈاکٹر رادھا کرشنن صدر، پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم اور ذاکر صاحب نائب صدر! تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے کون نہیں جانتا کہ ذاکر صاحب کے صدرِ حکومت رہنے سے ملک حکومت اور دار الخلافہ تینوں کی کیسی غیر متزلزل ساکھ تھی۔ سیاسی پالیسی کے تعین اور نظم و نسق کے تقاضوں کے اعتبار سے صدر مملکت محض آئینی صدر ہوتا ہے اور نارمل حالات میں وہ کوئی غیر معمولی اقدام نہیں کرتا۔ ایسے صدر کا بڑا اہم رول یہ ہے کہ اس کی ذہنی اور اخلاقی برتری ایسی ہو کہ وہ ملک کے اندر اور باہر حکومت کا ضمیر سمجھا جائے۔ ذاکر صاحب میں یہ صفت بیش از بیش تھی جہاں تک امورِ مملکت یا سیاسی پارٹیوں کے مزاج و مصلحت کا تعلق ہے، میری معلومات کتنی ہی ناقص یا نامکمل کیوں نہ ہوں لیکن ذاکر صاحب کے بارے میں اتنا جانتا ہوں کہ پارٹیوں، اعیانِ حکومت اور عامۃ الناس کو ذاکر صاحب کے علمی و اخلاقی فضائل، دیانت و امانت، ہوشمندی، ہمدردی اور شرافت و انسانیت کا جیسا صحیح اور براہِ راست احساس و اعتراف تھا وہ اپنی نظیر آپ ہے!

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے صدرِ مملکت کی حیثیت سے اپنے یا کسی اور ملک کے اندرونی یا سیاسی مسائل میں دخل دینا یا ان پر گفتگو کرنا ذاکر صاحب کے لیے نامناسب تھا نہ ممکن لیکن سیاست کا دائرہ یا مفہوم اتنا ہی نہیں جتنا بالعموم سیاسی پارٹیوں کے کارنامے ہیں کم، ان کے کرتوت میں زیادہ، ہر روز دیکھنے میں آتا رہتا ہے۔ سیاست کا ایک پہلو وہ بھی ہے جہاں ملک کے وقار و استواری کو نظر میں رکھتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سیاست اور دین (راستی و اخلاق) کو یک جا یا ایک دوسرے سے قریب رکھنے یا نہ رکھنے کا مرحلہ آتا ہے، اور یہ بڑا مشکل مقام ہے، جہاں تک میرے سمجھانے اور آپ کے ماننے کا تعلق ہے! ذاکر صاحب کا سیاست سے براہِ راست لگاؤ نہ تھا لیکن اس کے پیچ و خم اور داؤ پیچ سے بخوبی واقف تھے۔ بیشتر بڑے آدمی ایسے ہوتے ہیں۔ بایں ہمہ ایک اعلیٰ شخص اور معلّم (مصلح) ہونے کے سبب سے وہ سیاست اور سیاست گری کے رخ و رفتار اور وسیلہ و مقصد کو متوازن اور صحت مند رکھنے کا اپنے کو ذمہ دار سمجھتے تھے۔ اس ذمہ داری کو وہ خارجی وسائل سے نہیں صرف اپنی شخصیت کی بڑائی سے پوری کرتے رہتے تھے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ غیر ذمہ دار اشخاص شخصیت کی اتنی پروا نہیں کرتے جتنی شخصیت کی تاوقتیکہ وہ کسی نفسیاتی علت کا شکار نہ ہوں۔ صدرِ مملکت کی حیثیت آئینی طور پر کچھ بھی ہو، اخلاقی اعتبار سے وہ ملک اور قوم اور ان سے آگے بڑھ کر ضمیرِ انسانی کا امین و آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس رول کو اسے ادا کرنا پڑتا ہے۔ یہ اپنے کسی علم کے زور پر نہیں کہہ رہا ہوں اس لیے کہ علم اور زور دونوں اعتبار سے نیازمند واقع ہوا ہوں بلکہ ذاکر صاحب کے سانحۂ رحلت کے بعد کانگریس کے ڈسپلن میں جیسی المناک ابتری آئی اور حکومت

کو جس طرح کی نزاکتوں کا سامنا ہوا اس کے پیشِ نظر خیال آتا ہے جیسے ذاکر صاحب اپنی جگہ پر موجود ہوتے تو اس کی نوبت نہ آتی۔ بہار کا قصہ سنا چکا ہوں۔

کسی محکمے، کارخانے یا ادارے کی کامیابی اور نیک نامی کا مدار، اس کے قانون، ضابطہ یا عملے کی تعداد اور اختیارات پر اتنا نہیں ہے جتنا اس کے اراکین کی دیانتداری، فرض شناسی، دلسوزی، محنت اور قابلیت پر ہے۔ آج کل کے اداروں، محکموں اور دفتروں کو دیکھیے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ ان میں کام کرنے والوں اور حاصل کار کا تناسب کیا ہے۔ ہر طرف، ہر سطح پر ہر مواخذے سے بے نیاز جیسا کرپشن[1] (رشوت، چوری، گراوٹ، گندگی، حرام خوری) جس شدت سے جس پیمانے پر پھیلا ہوا ہے اس نے زندگی کو ایک اعلیٰ درجے کی ذمہ داری ہونے کے بجائے کرب و کراہت کی علامت بنا دیا ہے دامن کی پاکی حکایت کون چھیڑے اور کون آگے بڑھائے، جب بڑا گنہگار اپنے بندِ قبا کو دیکھ کر چھوٹے گنہگار کے دامن کو دیکھنے کی جرأت نہ کر سکتا ہو۔ کوئی مانے یا نہ مانے جب ابتری عام ہو اس وقت ایک اچھا اور بڑا شخص تنہا وہ کر سکتا ہے جو فوج، پولیس، الکشن، کانفرنس، یونتھ فسٹول طالب علم اور سادھو علیحدہ علیحدہ اور مل کر بھی نہیں انجام دے سکتے۔ اصلاح و دامن کے کاموں کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ایک پیغمبر بھیجا ہے، افواج کبھی نہیں بھیجیں ملک کے اعتبار و وقار کی بازیافت کے لیے ابھی ذاکر صاحب کی ضرورت تھی۔

---

[1] انگریزی کے دو الفاظ کرپٹ اور کرپشن کو اردو ہی نہیں ہندوستان کی تمام دوسری زبانوں کو بے تکلف قبول کر لینا چاہیے۔ جن میں سبھی مبتلا ہوں اس کے سمجھنے یا مقبول عام ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے۔

شائد ایک سے زائد کی!

ملک ہو، قوم ہو، ادارہ یا انجمن ہو ان سب کی وقعت و اہمیت کا اندازہ بالعموم اس کے سربراہ کی وقعت اور اہمیت سے لگاتے ہیں جو وقت آنے پر بڑی سے بڑی آزمائش یا بڑے سے بڑے شخص کے سامنے اپنے اخلاقی، علمی اور تہذیبی فضائل کی بنیاد اور بلندی پر کھڑا ہو سکتا ہو اور ملاقاتی یا مہمان واضح طور پر محسوس کرے کہ وہ میزبان کی بڑائی کا اعتراف کیے بغیر اپنی بڑائی نہ خود محسوس کر سکتا ہے نہ کرا سکتا ہے۔ اس طرح کے مواقع بالعموم اعلیٰ دانش گاہوں میں پیش آتے ہیں جہاں طلبا اور اساتذہ دونوں اپنے سردار کے قد و قامت کو مختلف پہلوؤں سے برابر پرکھتے رہتے ہیں۔ ان دونوں سے زیادہ شخصیت کا بے لاگ اکثر بے رحم پارکھ کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ ذاکر صاحب جہاں رہے اس مرحلے و منزل سے گزرتے رہے اور ہمیشہ ہر جگہ اس کا اعتراف کیا گیا کہ ہر محفل میں اور ہر محاذ پر ان کا قد سب سے نکلتا ہوا پایا گیا یہ ساکھ کا مدار شخص پر ہوتا ہے منصب پر نہیں۔ ذاکر صاحب کے عہد میں بڑے بڑے مواقع پر باہر سے آنے والے خواہ وہ کتنے ہی ممتاز کیوں نہ ہوں سب سے پہلے ذاکر صاحب کی خدمت میں اپنا ہدیۂ عزت و عقیدت پیش کرتے، طلبا کا اچھے سے اچھے الفاظ میں ذکر کرتے اور برابر اس کا لحاظ رکھتے کہ وہ ہندستان کی ایسی تاریخی مرکزی دانشگاہ میں آئے ہیں جو ہر اعتبار سے قابل لحاظ اقلیت کے تعمیری و تہذیبی حوصلوں، دوستداری اور وسیع المشربی کا بڑا مبارک و مقبول نمونہ ہے۔ یوں بھی اصطلاحاً ہم پر اقلیت کا چاہے جتنا اطلاق ہوتا ہو جہاں تک اس اقلیت کے علمی، تمدنی، تہذیبی اور انسان دوستی کا تعلق ہے وہ اکثریت سے پیچھے نہیں ہے۔ شاید ہندوستان سے باہر کی اکثریت

سے بھی۔

یہاں مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ ذاکر صاحب کی جامع حیثیات شخصیت ایسی تھی کہ وہ حکومت کے ان مسائل مہمہ کو بھی سلجھا، یا ان کو صحیح خطوط پر رکھ سکتے تھے جو آئین کی رو سے ان کے اختیارات سے باہر تھے۔ قوم اور ملک کے سب سے بڑے سربراہ میں یہ صفت موجود ہو تو ہر تعصب و تنگ نظری سے بلند ہو کر فخر کرنا چاہیئے۔ ایک مشہور قول ہے "مرنے سے پہلے مرجاؤ" اس کی ایجابی و تعمیری تعبیر یہ ہے کہ "پانے سے پہلے پالو" ذاکر صاحب نے یہی راستہ اختیار کیا تھا۔ وہ ہر منصب پر فائز ہونے سے پہلے اس پر فائز ہو چکے ہوتے تھے یعنی اس عہدے کے لیے جیسے اخلاقی، علمی اور تہذیبی اوصاف کی ضرورت ہوتی اُسے مدتوں کے ریاض سے اپنا چکے ہوتے تھے۔ نظر برآں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ صدرِ مملکت ہونے سے پہلے وہ صدرِ مملکت بن چکے تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ زندگی نے وفا کی ہوتی تو وہ صدارت کے منصب سے سبکدوش ہو کر بھی صدر رہتے! ذاکر صاحب کے ان اوصاف کو مدِ نظر رکھیں تو یہ سمجھنا دشوار نہیں رہتا کہ وہ محض اپنے کردار سے ملک کے وسیع اور بہترین مقاصد کو روبراہ کرنے اور رکھنے میں معین ہوتے تھے ہندوستان جیسے اخلاقی اقدار و روایات اور تاریخی و تہذیبی تنوع و تضاد کے ملک میں صدر مملکت کا کردار ایسا ہی ہونا چاہیئے جس کے آگے ہر کرتوت کو جھکنا پڑے۔!

نائب صدر اور صدرِ مملکت ہونے کی حیثیت سے انہوں نے بہت سے بیرونی ممالک کا دورہ کیا تھا اور وہاں کے اعظام و اکابر سے متعارف ہوئے تھے۔ ظاہر ہے اس طرح کی دید و بازدید معینہ ضوابط کی تحت ہوتی تھی۔ عقل اس کو باور نہیں کرتی کہ ملکوں اور حکومتوں کے صنادیدِ عظام اعلیٰ

ترین سطح پر ایک دوسرے سے ملتے ہوں اور بقول سرسید صرف یہ کہہ یا سن کر ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہوں "کیوں صاحب آپ منگل کو انڈے کھاتے ہیں یا نہیں؟" اتنے بڑے لوگ ملتے ہوں گے تو معرض بحث میں نہیں تو معرض گفتگو میں کچھ بڑی باتیں بھی ہوتی ہوں گی۔ یہ اور بات ہے کہ معرض تحریر میں نہ لاتے ہوں، زندگی اور زمانہ جس شدائد سے گزر رہا ہے اور جیسی جیسی نزاکتوں اور ہلاکتوں کا انسان اور انسانیت کو سامنا ہے ان پر کچھ نہ کچھ گفتگو آتی ہو گی چاہے ان کی حیثیت تمام تر علمی اور انفرادی ہو۔ ذاکر صاحب جیسے صاحب اخلاق و کردار، دانشور، ذہین و ذکی، بیش از بیش علوم سے باخبر راستی، پاکیزگی اور خوبصورتی کے دوستدار، خیر و خدمت کے نمائندہ اور پیغامبر، تحریر و تقریر میں بے مثل، گفتگو میں شائستہ و شگفتہ، مباحثہ و مذاکرہ میں ناقابل تسخیر، زندگی اور زمانے کے خیر و شر سے خبردار، ہر محفل میں مقبول، ہر محاذ پر محترم، جس کی دردمندی ہر زخم کا مرہم اور جس کی دلجوئی ہر مایوسی و مظلومی کا مداوا تھی، ان کا سامنا کسی مسئلے یا محاذ پر دنیا کے اکابر سے ہوتا ہو گا تو کیسا محسوس کرتے ہوں گے جب ان کو رفتہ رفتہ معلوم ہوتا ہو گا کہ جو بات معرض گفتگو میں ہے اس پر آخری لفظ کہنے والے ذاکر صاحب ہی ہوں گے! ذاکر صاحب اور علم و فن کے بڑے بڑے ماہرین کو بارہا سرگرم گفتگو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اوروں کو بھی ہوا ہے۔ سب کا فیصلہ یہی ہے کہ قول فیصل ذاکر صاحب ہی کے حصہ میں آتا تھا۔ یہی نہیں جہاں ذاکر صاحب ہوتے وہاں پر مباحثہ و مذاکرہ کا افتتاح و اختتام شادمانی و شگفتگی کی فضا پر ہوتا۔

ذاکر صاحب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ اسی زمانے میں مجھ پر قلب کا دورہ پڑا۔ میں نے بڑی بڑی بیماریاں اٹھائی ہیں۔ ایک سے ایک نازک اور تکلیف دہ آپریشن کرائے اور مدتوں ان کے عذاب جھیلے ہیں لیکن اس قدرت سے اور راضی برضا رہ کر جیسے زندگی کے سفر میں یہ مرحلے خوش و ناخوش گزار دیے یا گزر جانے ہی کے لیے آتے ہوں۔ لیکن کس قیامت کے درد و کرب کا یہ قلب کا دورہ تھا! بارے وہ درد اور دورہ دونوں دور ہوئے لیکن کیا چھوڑ گئے وہ بھی ناقابلِ بیان ہے۔ ذاکر صاحب دیکھنے آیا کرتے تھے۔ میرے کمرے کا دروازہ اس رخ سے ہے کہ چارپائی پر لیٹے ہوئے بیرونی دروازے تک تقریباً ڈیڑھ سو فٹ تک آتے جاتے ہوئے لوگوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ ذاکر صاحب حسبِ معمول سپید کھدر کے نہایت ستھرے اور خوش قطع لباس میں باغ پر نظر ڈالتے ہوئے، ہموار مضبوط قدموں سے نہ جلد جلد نہ آہستہ آہستہ، بالکل اسی طرح جیسے ہمیشہ چلتے تھے آتے ہوئے نظر آتے۔ کتنا مردانہ دلکش شریفانہ سراپا تھا اور کیسی امید، وقار اور ہمدردی کی فضا اور دعوت بکھیرتے ہوئے آتے تھے! ان میں انسانیت، علم، ذہن، فطرت سب کا حسن اکٹھا ہو گیا تھا۔ ان کی موجودگی میں تمام دوسرے حسن اضافی معلوم ہونے لگتے تھے۔ یوں بھی انسان سے زیادہ خوبصورت کون ہوا ہے۔

عام تیمارداروں سے ان کا انداز جداگانہ تھا۔ بالکل شخصی اور انفرادی جیسا کہ ذاکر صاحب ہی کا ہو سکتا تھا۔ نہ خواہ مخواہ ہنستے بولتے ہوئے کمرے میں داخل ہوتے نہ تسکین و تشفی یا تفریح و تماشے کے بندھے ٹکے کلمے زبان پر لاتے۔ علاج معالجہ، ڈاکٹروں کی آمد و رفت یا کھانے پینے کے بارے میں کوئی گفتگو نہ کرتے۔ چہرے کو نہ متفکر بناتے نہ ہونے دیتے۔ بس آتے اور

بغیر کسی تکلیف یا تصنع کے چارپائی سے متصل تخت پر گاؤ تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ جاتے جیسے تیمارداری کا فریضہ ادا کرنے کے لیے نہیں بلکہ تمام کاموں سے فارغ ہو کر خوش وقت ہونے اور خوش وقت کرنے کے لیے آئے ہوں۔ بالکل جس طرح نارمل حالات میں تشریف لایا کرتے تھے۔ بہت بے قرار پاتے تو تخت چھوڑ کر چارپائی کی پٹی پر بیٹھ جاتے اور میرا ہاتھ اپنی دونوں ہتھیلیوں میں لے کر دھیرے دھیرے دبانے لگتے۔ ایک لفظ نہ کہتے لیکن چہرے سے ایسا معلوم ہوتا جیسے امید اور آرام کی بشارت دے رہے ہوں۔ اس سے اسی طرح کی تسکین ملتی جیسے کوئی زود اثر مسکن دوا TRANQUILISER دی گئی ہو۔ خدا کے جس اچھے بندے کو اپنے رب کا کلام سن کر بیماری کی شدت میں تسکین مل جاتی ہو اور جس نے قاتلوں کے جمِ غفیر میں اللہ اور اسلام کا برملا اقرار کر کے جامِ شہادت پینے کا حوصلہ دکھایا، اسی کی ہتھیلی کے لمس میں یہ تاثیر مل سکتی تھی۔ جب تک وہ زندہ رہے یہ بات یاد نہ آئی۔ آج جبکہ وہ آسودۂ رحمت ہیں پچھلا سماں آنکھوں کے سامنے ہے۔ گریہ اٹھتا ہے، آنسو امنڈ آتے ہیں اور سانس میں گرہیں لگتی معلوم ہوتی ہیں اور سوچنا اور لکھنا ناممکن معلوم ہونے لگتا ہے۔ اسی دوران میں عید آگئی۔ طبیعت اب سنبھل گئی تھی نماز پڑھ کر سیدھے میرے یہاں پہنچے اور تخت کے بجائے چارپائی ہی پر بیٹھ گئے۔ اس وقت ان کے چہرے پر شادمانی کی وہ شبنم تھی جس میں صبح کی تازگی اور سورج کی اولین کرنوں کی الماس پاشی ملتی ہے۔ جیب سے ایک لفافہ نکالا۔ اس میں سے ہاتھی دانت کا بڑا خوبصورت ورق تراش، کتاب میں رکھنے کا نشان۔ چھوٹے چھوٹے نازک ترشے ہوئے پھول پتیاں اور چند رنگین کارڈ جن پر مشہور عالم مصوروں کے شاہکار چھپے ہوئے تھے ایک ایک کر کے اس انداز اور ایسے الفاظ کے

ساتھ جن میں محبّت، تفریح اور تکریم کی ناقابلِ بیان کیفیت تھی نکال کر دیے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے عید کے دن ان تحائف کے ساتھ یہ مژدہ بھی دے رہے ہوں جیسے دکھ اور درماندگی کے دن دور ہوئے اور خدا نے مشکل آسان کر دی

ذاکر صاحب کو بیشتر چھوٹے بڑے لوگوں نے ہر حال میں دیکھا ہے، قرول باغ سے لے کر راشٹرپتی بھون تک کی ان کی رہن سہن سب کے سامنے ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کو ایسے سیدھے اور سچے راستے پر ڈال دیا تھا کہ بدلے ہوئے حالات میں بھی ان پر نظرِ ثانی کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی بلکہ بدلے ہوئے حالات ہی کو ذاکر صاحب کے اختیار کیے ہوئے راستے پر آنا پڑا۔ عام طور پر لوگ ہوا کے رُخ کو دیکھتے ہیں اور اسی کو اختیار کر لیتے ہیں۔ ذاکر صاحب ان عظیم شخصیتوں میں تھے جن کو دیکھ کر کبھی کبھی ہوا کو اپنا رخ بدلنا پڑتا تھا وہ جن اعلیٰ صفات سے متصف تھے وہ ان میں اس طرح رچ بس گئے تھے کہ وہ جہاں ہوتے جس حال میں ہوتے ہمیشہ علم، عافیت اور عزت کے پیامبر نظر آتے۔ زندگی کے حسن و قبح کے پرکھنے میں زیادہ تر شخص کی رہن سہن، کھانے پینے، اوڑھنے پہننے، میل ملاپ، فکر و نظر اور خیر و خدمت کے طور طریقوں کو مد نظر رکھتے ہیں۔ ذاکر صاحب قرول باغ کے جس معمولی و مختصر مکان میں رہتے تھے وہ کسی اعتبار سے قابلِ لحاظ نہ تھا اور آباد و آبادکاری کے فشار میں اب تک گھس نہ گیا ہو تو کیا عجب لیکن اس کو اندر سے ایسا بنا رکھا تھا جس میں ضرورت آرام اور خوبصورتی ہر چیز تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی جو بہ مشکل کہیں نظر آئے گی کہ کوئی چیز بے قرینہ نہیں تھی۔ ایسے مکان میں بے تکلف کسی وقت بھی بڑے سے بڑے آدمی کی پذیرائی کی جا سکتی تھی۔ قرینہ اور بے قرینہ کا صحیح تصور

مہاتما گاندھی کے اس قول سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ ہر چیز DIRT (کوڑا یا گندگی) ہے جو اپنی جگہ پر نہ ہو یعنی بے قرینہ رکھی ہو۔ میں نے ذاکر صاحب کے یہاں قرول باغ اور جامعہ نگر میں جتنا خوش ذائقہ اور ستھرا کھانا کھایا ویسا ان کے سرکاری دسترخوان پر نہ ملا۔ برتن، دسترخوان اور آس پاس کی صفائی اور خوشنمائی کا التزام اس سے کچھ زیادہ ہی دیکھا جتنا ان حالات میں کوئی بھی قرول باغ یا جامعہ نگر میں رکھ سکتا تھا۔ پھر اسی دسترخوان پر خلوص، خوشدلی اور خوش دلی کی وہ فضا جسے ذاکر صاحب ہی جیسا میزبان فراہم کر سکتا تھا۔

کسی کو کھانا کھاتے دیکھ کر آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ شخص کس قماش کا ہے اس لیے کہ کھانے کے آداب، زندگی کے دوسرے آداب سے جداگانہ نہیں ہوتے۔ زندگی کے ڈھکے چھپے جتنے وظائف ہیں وہ سب ایک دوسرے سے مکمل طور پر مربوط ہیں۔ ایک میں بھی جھول ہوگا تو اونٹ ہی نہیں اس شخص کی بھی کوئی کل سیدھی نہ ملے گی۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص دسترخوان پر پھوہڑ ہو اور جانماز پر نہ ہو۔ کھیل کے میدان میں کھوٹا ہو اور کاروبار میں کھرا ہو۔ علی گڑھ میں کچھ لوگوں کو رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ چند مہمان باہر سے آئے ہوئے تھے۔ کچھ یونیورسٹی کے اور دو تین حکام ضلع تھے۔ اتفاق سے مجھے جن صاحب کے قریب جگہ ملی وہ کھانے پینے کے تمام وظائف بالجہر ادا کرتے تھے اور اس ندیدے پن سے کھا رہے تھے جیسے زندگی میں ایسا موقع نہ پہلے کبھی ملا تھا نہ آئندہ ملے گا۔ کھانے پینے میں چپڑ چپڑ کرنا، پینے میں سڑپنا، پانی غٹ غٹ پینا، ڈکار لینا اور چاول اور شوربہ یا سالن کو ملا کر ہاتھ سے کھانا اور سنی ہوئی انگلیوں کو پلیٹ میں بار بار چھڑکنے اور چاٹنے یا ہڈی کی نلی میں سے گودا نکالنے کے لیے ہاتھ پر ہاتھ مارنا یا بار بار منھ میں ڈالنے نکالنے سے

مجھے بڑی گھن آتی ہے اور کھانے کی تقریب عذاب بن جاتی ہے۔ میرے ہم نشین یہ سب کر رہے تھے۔ کسی طرح کھانے اور کافی کا دور ختم ہوا۔ میز پر سے لوگ اٹھ گئے تو ٹہلتے ہوئے آئے اور میرے بازو پر ہلکے سے ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرا کر بولے "آپ کو کھانا اچھا ملا ہو یا نہیں ساتھی اچھا ملا تھا!"

ذاکر صاحب کھانے کے آداب جس طرح ملحوظ رکھتے تھے اور جس نفاست سے اس کو ادا کرتے تھے وہ بالکل ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی بڑا فنکار مثلاً مصور، مغنی یا سرجن اپنے فن کا حق ادا کر رہا ہو۔ راشٹرپتی بھون میں ذاکر صاحب کے دستر خوان پر کھانا کھانے اور ایک آدھ دن وہاں بسر کرنے کا اتفاق ہوا۔ قصرِ حکومت کی شان و شوکت، امارت و اقتدار کی فضا، خورد و نوش کے ساز و سامان، دستر خوان سے متعلق عملہ اور ان کے آداب کا ایک عالم ہوتا بہ ایں ہمہ محسوس ہوتا کہ یہ سب اپنی قدر و قیمت صاحبِ محفل کی شخصیت سے اکتساب کر رہے ہیں۔ یہاں یہ حقیقت بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ہر صاحب محفل، صاحب محفل نہیں ہوتا۔ ہر خوبی و زیبائی منصب نہیں شخص اور شخصیت کی خوبی و زیبائی کی محتاج ہوتی ہے۔ جو شخص یا شخصیت اپنے امتیاز و اعتبار کے لیے کسی عہدہ یا منصب کی محتاج ہو وہ ساقط الاعتبار ہے۔ جہاں ذاکر صاحب کا نیچ ہو وہاں سے ان کو جدا کر کے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ باقی کیا رہ جاتا ہے مجنوں کے نکل جانے سے جنگل ہی نہیں اداس ہو جاتا بستی اور بھی زیادہ اداس ہو جاتی ہے لعل و گوہر کی قیمت اور وقعت گوہر فروش کی دوکان میں نہیں عقدِ گردنِ خوباں میں کھلتی ہے۔

نئی دہلی اور وائسرائے ہاؤس (راشٹرپتی بھون) سر ایڈورڈ لٹینس (SIR EDWARD LUTYENS) اور جین ٹیلر (JANE TAYLOR)

کے خونِ جگر کی نمود ہیں۔ وہ خونِ جگر جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے۔ یعنی "فن کار کے ہنر و حوصلہ، جسم و جاں، ذہن و ذوق اور عبادت و ریاضت کا افشردہ یا کشید"۔ ان شاہکاروں کو جو دیکھے گا ہمیشہ اور غیر شعوری طور پر ان کو ظہور وجود میں لانے والے حضور میں اپنی عقیدت کا ہدیہ پیش کرے گا لیکن جیسا کہ ابھی ابھی کہا گیا ہے مکاں کو شرف مکیں سے ہے۔ سینا اور صلیب کی تمام تر منزلت موسیٰ اور مسیح سے ہے۔ جامعہ کے ابتدائی دور کا نقشہ، قرول باغ کے خرابے یا مزبلے میں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اسی طرح قصرِ سلطانی (راشٹرپتی بھون) بام و در شان و شوکت گل و گلزار، ساز و سامان نقش و نگار اور خدم و حشم بھی نظر میں ہیں۔ دونوں مقامات پر ذاکر صاحب کی شخصیت کے تصرف کا عالم جدا تھا۔ کتنا واضح، کتنا بامعنی و بامقصد کتنا قیمتی و عجیب! شاید اسی طرح کی کیفیت نے اصغر گونڈوی سے یہ شعر کہلوایا تھا ؎

فروغِ حسن سے تیرے چمک گئی ہر شے　　ادائے رسمِ بلالی و طرزِ بوذری!

ذاکر صاحب بڑے فکر مند اور کوشاں رہتے تھے کہ جامعہ کے ہائی اسکول کے امتحانات کو سرکاری محکمۂ تعلیم تسلیم کرلے۔ اسی زمانے میں یا اس کے آس پاس سارجنٹ اسکیم شائع ہوئی تھی جس کا بڑا شہرہ تھا اور جا بجا اس کی تبلیغ کی جارہی تھی۔ اس سے پہلے وارد ھا تعلیمی رپورٹ منظرِ عام پر آچکی تھی۔ مسٹر سارجنٹ اور ان کے رفقا جامعہ ملیہ کو قریب اور تفصیل سے دیکھنے گئے۔ ہفتہ عشرہ بعد ذاکر صاحب علی گڑھ تشریف لائے۔ نہایت خوش و خرم۔ ان کی شادمانی بھی دیکھنے کی چیز ہوتی تھی بالخصوص جامعہ سے اور جامعہ کے ابتدائی دور سے متعلق۔ جیسے ان میں فنونِ لطیفہ کی تمام رعنائی اور تہذیب و اخلاق کی گرانمائگی

سمودی گئی ہو۔ پوچھا: ذاکر صاحب جامعہ میں سارجنٹ صاحب پر کیا گزری خوش ہو کر کہا وہ جامعہ کے مقاصد، نظم و نسق، نصاب، معیار اور پروگرام سے بہت مطمئن اور خوش ہوئے۔ میں نے دریافت کیا، یہ تو بتائیے سارجنٹ صاحب کو جامعہ سے متعلق تمام باتیں دکھانے سمجھانے کے لیے ساتھ کون تھا، بولے "کیا مطلب، میں تھا!" میں چپ ہو گیا۔ چونک کر بولے "نہیں نہیں کچھ فرمائیے" ذاکر صاحب کا چیلنج کا یہ انداز بڑا پُر لطف ہوتا تھا۔ ان کے بعض قریب ترین عزیزوں میں بھی یہ جھلک ملتی ہے۔ عرض کیا کہ جب آپ ہی دکھانے بتانے والے تھے تو ظاہر ہے غریب کو اپنی قوت ممیزہ اور قدرتِ فیصلہ کو کام میں لانے کی کہاں تک سکت رہی ہوگی۔ آپ تو اسے قرول باغ (اس وقت کا) دکھا کر بتا دیتے کہ یہ ازہر یا آکسفورڈ ہے تو وہ کہتا آمنا و صدقنا! ذاکر صاحب ہنس دیے یہ مبالغہ نہیں ہے جہاں ذاکر صاحب معرضِ گفتار میں آئیں وہاں باطل تھا دعوی ہوشیاری کا!

بے داغ اور بے شکن سفید کھدر کی ٹوپی، شیروانی اور پاجامہ میں ملبوس ذاکر صاحب دلکش نظر آتے تھے، یوں بھی بڑے خوش شمائل اور جامہ زیب تھے۔ جہاں ہوتے خوشی اور خلوص کی فضا پیدا ہو جاتی اور پھیلنے لگتی۔ کھدر کے اوصاف کے بہت سے لوگ قائل ہیں۔ میں اس کو اس لحاظ سے خاص طور پر قابلِ احترام سمجھتا ہوں کہ یہ ایک عظیم روایت اور عظیم تر شخصیت کا نشان یا سمبل ہے جس نے ہندوستان کو اس کی اخلاقی روایات، ملکی اور قومی ذمہ داریوں اور عالمی تقاضوں سے آشنا کرایا۔ مجھے کھدر کی شیروانی اور پاجامہ زیادہ خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ کھدر کا لباس دیر تک صاف ستھرا رکھا جا سکتا ہو یا نہیں، دیر تک صاف ستھرا نظر نہیں آتا۔ صاف و ناصاف سے قطع نظر ذاکر صاحب

ہر روز کپڑے تبدیل کر دیتے تھے۔ ان کے لباس میں کبھی سلوٹ یا شکن نظر نہ آئی۔ میرا خیال ہے کہ ایسے لوگوں کو کھدر پہننے میں عجلت سے کام نہیں لینا چاہیے جن کی شکل اچھی ہو نہ اطوار!

کیا دن تھے اور کیسی باتیں جو اس وقت بغیر ارادے کے یاد آ رہی ہیں ذاکر صاحب اور ان کے بھائیوں کی جائداد اور تعلیم کا انتظام مدتوں ان کے خالو صاحب کرتے رہے۔ ذاکر صاحب کہتے تھے کہ سال کے شروع میں وہ سفید موٹے کپڑے کے چھ سات کرتے پاجامے سلوا کر ایک خاص اسٹائل سے بھائیوں میں تقسیم کر دیتے۔ کالج کھلنے پر علی گڑھ آنے والے ہوتے تو بلاتے اور سامنے رکھے ہوئے کرتے پاجاموں کو ایک ایک کر کے گنتے اور دیتے جاتے مقرّرہ تعداد پوری ہو جاتی تو کہتے اٹھا لو۔ ذاکر صاحب کہتے تھے کہ دینے کا یہ انداز خالو ہونے کا کم پٹھان ہونے کا زیادہ ہوتا تھا۔ یہ کوٹا کبھی نہیں بدلتا تھا البتہ ہم کو اختیار تھا کہ جب چاہیں اور جتنا چاہیں خالص گھی منگا سکتے تھے۔ اس کی شہادت اس وقت کے سارے ساتھی دے سکتے ہیں کہ ذاکر صاحب اس رعایت کا فائدہ جی بھر کے اٹھاتے تھے جاڑوں میں صبح کے ناشتے میں ماش کی کھچڑی کے لیے، جس کی دعوت عام تھی وہ خالو صاحب سے گھی ضرور منگاتے جو سیروں آتا۔ جلد سے جلد آتا اور بذریعہ ڈاک آتا۔ اس زمانے میں کچھ اور نہیں تو خالص گھی خارج از قیاس نہ تھا۔ محصول ڈاک منصفانہ اور شریفانہ تھا اور ذاکر صاحب ہی نہیں دوسروں کے خالو بھی بات کے دھنی ہوتے تھے۔

ذاکر صاحب کو تمام عمر کرتہ ہی پہنتے دیکھا قمیص کبھی نہیں۔ ان ہی روایتی آستینوں، گریبان اور جیب و دامن کے ساتھ جو اردو شاعری بالخصوص غزل کی ہزار شیوگی میں مسلسل اضافے کرتے رہتے ہیں۔ ذاکر صاحب نے

اپنے کرتوں کی آستین گریبان اور دامن کے ساتھ چاہے جیسا سلوک کیا ہو اپنی جیب کی عزت کا ہمیشہ خیال رکھا۔ داہنی طرف لٹکتا ہوا جیب، جس میں انہوں نے نہ کبھی ہاتھ ڈالا، نہ رومال رکھا نہ کبھی نہ کاغذ نہ پیسے نہ ریوڑی! ظاہر ہے ایسی جیب میں کسی دوسرے کے ہاتھ کے لیے کیا ترغیب، اشارہ یا گنجایش ہو سکتی تھی۔ اتنے حصے سے دھوبی کو بھی تعرض نہ ہوتا ہو تو کیا عجب! ایم اے او کالج کا یونیفارم سیاہ ترکش کوٹ، ترکی ٹوپی، اوسط مہری کا سپید پاجامہ اور انگریزی جوتا تھا۔ انگریز اساتذہ یونیفارم کی پابندی پر بہت زور دیتے تھے، خاص طور سے اس پر کہ جوتے پر تازہ پالش ہو، اوپر سے نیچے تک کوٹ کے سارے بٹن لگے ہوں اور لباس ملگجا نہ ہو۔ کوٹ میں پورے بٹن نہ لگے ہوتے تو انگریز فوراً ٹوک دیتے کالج سے یونیورسٹی ہوئی۔ پھر یہ پابندیاں رفتہ رفتہ اٹھ گئیں اور ایسی اٹھیں کہ یونیفارم کی پابندی درکنار ہر پابندی کا تصور عدم پابندی رہ گیا ہے۔ ذاکر صاحب نے اس پابندی کو آخر تک نباہا۔ ان کی شیروانی کا ایک بٹن بھی کھلا ہوا نہیں پایا گیا۔ شیروانی اور ٹوپی بغیر ان کو شاید ہی کسی نے دیکھا ہو۔ ان کے جوتوں پر ہمیشہ تازہ پالش ملی۔ وائس چانسلری کا عہد تھا۔ لکھنؤ سے ایک صاحب ملنے آئے، شیروانی کے سارے بٹن کھلے ہوئے۔ صرف آخری نچلا بٹن لگا ہوا تھا۔ اودھ میں شیروانی پہننے کا اسٹائل بھی شاید یہی ہے۔ ملاقاتی رخصت ہو گئے تو مسکرا کر بولے، کیسی اور جنٹل طبیعت پائی ہے شیروانی کے تمام بٹنوں کا کام صرف ایک ناف سے لے لیا۔

ذاکر صاحب کی وفات پر کسی نے رائے عامہ کا سروے تو نہیں کیا لیکن بڑے سے بڑے اور معمولی سے معمولی اشخاص سے پہلی بات جو سننے میں آئی وہ

یہ تھی کہ اب مصیبت میں دلجوئی کون کرے گا اور دشواری میں صحیح مشورہ کون دے گا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ہمدردی اور دانش مندی پر لوگوں کو کتنا بھروسہ تھا اور اس کا حلقہ کتنا وسیع تھا۔ بڑے ذی حیثیت اصحاب کو یہی کہتے سنا کہ ذاکر صاحب کی موجودگی سے بڑی تقویت تھی۔ کوئی مشکل آن پڑتی اور فیصلہ کرنے میں دشواری ہوتی تو ذاکر صاحب سے رجوع کرتے وہ اس ہمدردی سے ایسی صائب رائے دیتے کہ مشکل آسان ہو جاتی۔ گورنر، وائس پریسیڈنٹ اور پریسیڈنٹ رہنے کے زمانے کے حالات مجھے زیادہ نہیں معلوم ہیں لیکن سننے میں یہی آتا رہا کہ ان اعلیٰ مناصب پر فائز ہوتے ہوئے اور ان کی پابندیوں کے باوجود وہ ملنے والوں کے لیے سہل یاب تھے ان میں اتنی خوبیاں مجتمع ہو گئی تھیں کہ وہ مرجعِ خواص نہیں مرجعِ خلائق ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اس کی مثال اس زمانے میں دیکھنے میں آئی تھی جب وہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ جتنی جلد اور غیر متوقع طور پر حالات بدلتے ہیں روایات نہیں بدلتیں۔ مسلم یونیورسٹی کی ہیئت و حیثیت جیسی کچھ رہ گئی ہو، اس کی حرمت کا احساس اس کی اعلیٰ روایات سے وابستگی اور اس سے ہماری بہترین توقعات کا وابستہ ہونا وہی ہیں جو پہلے کبھی تھیں۔ ان تمام لوگوں نے جو ذاکر صاحب اور علی گڑھ دونوں کو عزیز رکھتے تھے اور مایۂ افتخار جانتے تھے ذاکر صاحب کو وہی جگہ دی جو ام اے او کالج کے آنریری سکریٹری کو حاصل تھی۔ کسی کو کوئی دشواری کہیں پیش آتی وہ ذاکر صاحب سے رجوع کرتا۔ یہ مشکلات طرح طرح کی ہوتیں ذاتی، سیاسی، علمی، نفسیاتی اور کبھی کبھی نفسانی بھی! اسٹاف، طلبا، چھوٹے بڑے ملازمین جب تک اپنی مشکلات لے کر ذاکر صاحب تک نہ پہنچ لیتے ان کی تشفی نہ ہوتی۔ اس میں وہ حق بجانب ہوتے اس لیے کہ بالآخر ذاکر صاحب

ان کی تشفی کا کوئی نہ کوئی سامان کر دیتے۔

ذاکر صاحب کو جس طویل مدت تک جتنا قریب سے میں نے دیکھا، سمجھا اور ان کا معترف اور مداح رہا شاید دوسروں کو ایسا اتفاق نہ ہوا ہو۔ لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ جن لوگوں کو رفاقت مجھ سے کم میسّر رہی وہ بھی میری طرح ان کو عزیز و محترم رکھتے تھے۔ جیسے ان سے مل لینا اور اعتبار و عزت کرنے لگنا ایک ہی بات ہو جس کے لیے زمان و مکان کی تخصیص و تحدید کی بالکل ضرورت نہ ہو۔ وہ سچے بندگانِ خدا کا حق اسی شوق، پابندی اور احساسِ ذمہ داری سے ادا کرتے تھے جس طرح سے وہ خدا کے مقرر کیے ہوئے فرائض روزہ نماز وغیرہ ادا کرتے تھے۔ نماز روزہ کو میں نے یہاں شرعی یا اصطلاحی معنوں میں نہیں لیا ہے بلکہ اس کو ایک مکمل ڈسپلن سے تعبیر کیا ہے۔ انسانی زندگی کے تقاضوں کو اقدارِ اعلیٰ کی روشنی میں سمجھنے اور پورا کرنے میں جتنے واضح اور مکمل آداب و ہدایات نمازیں ملتے ہیں وہ مشکل کہیں اور ملیں گے۔ مقررہ نماز تو وقتہ ہوتی ہے لیکن اس کی ڈسپلن ہمہ وقتی، ہمہ جہتی اور ہمہ گیر ہوتی ہے۔ ہماری تہذیبِ نفس اسی ڈسپلن کا عطیہ ہے۔ اگر یہ ڈسپلن پوری نہیں ہوتی تو نمازی کو سمجھ لینا چاہیے کہ احکامِ شرعیہ کے تقاضے پورے ہوئے نہ منشائے الٰہی کی تعمیل ہوئی۔ یہ باتیں میں نے نماز کے ماہرین نہیں بلکہ نماز کے محرومین کی طرف سے پیش کی ہیں اگر ان سے اتفاق نہ کیا جا سکے تو مجھے گردن زدنی نہیں بلکہ ناقابلِ التفات قرار دے کر بخش دینا چاہیے۔ ذاکر صاحب میں اس تہذیبِ نفس کی بڑی اچھی جلوہ گری ملتی تھی۔ وہ عالم، عامی، بوڑھا، بچہ، نوجوان، ذی حیثیت، کم حیثیت، امیر و غریب سب سے اس کی صلاحیتوں اور اس کے ذرائع اور وسائل کے مناسب حال ہمدردی کرنے اور جن تکالیف اور دشواریوں میں وہ مبتلا ہوتا اس کو اپنی

تکلیف و دشواری سمجھ کر مشورے یا مدد سے حتی الوسع دور رہتے ان کو کم کرنے کی فکر کرتے۔ غرض کیسی ہی ہو، کسی کی ہو اس کو پوری توجہ اور ہمدردی سے سننے اور مشورہ یا مدد دینے سے ذاکر صاحب کبھی نہیں اکتاتے۔ زیادہ سے زیادہ غرض مندوں کی صرف سنتے رہنا اور نہ اکتانا میرے نزدیک کسی کے گور کے اندر خلد کا ایک در کھلنے کا موجب ہو سکتا ہے۔

ممکن ہے بعض اصحاب جو ذاکر صاحب سے اچھی طرح واقف نہ ہوں یہ خیال کرنے لگے ہوں کہ وہ زاہدِ خشک یا سادھو سنت قسم کے لوگوں میں سے تھے۔ اس کے بالکل برعکس ان جیسا ذہین، طباع، فریس و فہیم، شگفتہ رو اور شگفتہ خاطر، بے تکلف، رفیق و شفیق کم ملے گا۔ کبھی اور کہیں ایک بات آج سے بہت پہلے کہی تھی اسے آج یہاں دہرانا چاہتا ہوں کہ سفر ہو یا حضر، معرکہ ہو یا محفل، رنج ہو یا راحت، تنہا ذاکر صاحب ساتھ ہوں تو پھر کسی دوسرے ساتھی کی ضرورت نہیں۔ خوبی اور خوبصورتی کا وہ ایسا مجموعہ تھے۔ عمداً یا سہواً کسی نے ان کی طنز و طباعی کی رگ کو چھو یا چھیڑ دیا اور ذاکر صاحب نے اسے قابلِ التفات سمجھا تو پھر مخاطب کو ایسا جھٹکا لگتا جیسے اس نے بجلی کا کھلا ہوا تار چھو لیا ہو۔ طنز و طباعی کے لیے بر وقت و بے خطا حربے، انداز و لب و لہجہ کے اختلاف کے ساتھ، مولانا محمد علی، عبدالرحمٰن صدیقی اور ذاکر صاحب کام میں لاتے تھے وہ میں نے کہیں اور نہیں دیکھے۔ گو جن کو میں نے دیکھا اور سنا ان کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے۔ ذاکر صاحب کی یہ خصوصیت طالبعلمی کے عہد سے لے کر آخر تک قائم رہی ورنہ بالعموم وہ نہایت دوستانہ اور شگفتہ موڈ میں رہتے ہیں۔ شاید ہی کبھی کبیدہ خاطر یا مایوس نظر آتے ہوں۔ ایک لطیفہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا۔ دہلی میں خونریزی اور سفاکی کا جو عالم تھا وہ کس کو بھولا ہوگا۔ مصیبت زدہ اور پناہ گزینوں کی خدمت اور خبر گیری کے لیے دن رات ذاکر صاحب دوا دوش میں رہتے۔ لیڈی ماؤنٹ بیٹن کے روزانہ کے پروگرام میں یہ بھی تھا کہ ذاکر صاحب کو ہمراہ لے کر غیر مسلم حلقوں میں بھی دریافت حال کے لیے جا نکلتیں۔ ذاکر صاحب ہی ترجمان ہوتے۔ کچھ دن بعد ملاقات ہوئی تو میں نے بڑے تردد سے پوچھا، ذاکر صاحب دہلی میں جو قیامت برپا تھی اس میں آپ کہاں کہاں پہنچتے رہتے کچھ نہ کچھ تو آپ کی جان کا بھی آپ پر حق تھا بڑے لطف سے فرمایا "کیا کرتا، بعد میں . . . . کہتے خواتین کا حق نہیں پہچانتا اور مولانا . . . . فرماتے خدا پر بھروسہ نہیں کرتا!" اس میں جانِ سخن وہ دو نام تھے جو لیے تھے۔ جان ہی کے خیال سے یہاں ان کا اظہار نہیں کرتا!

میری آرزو یہ رہی ہے جو اب عادت بن چکی ہے کہ اچھی سے اچھی شے یا شخص علی گڑھ کا ہو، اچھی سے اچھی چیز علی گڑھ میں ملے اور ایسے ہی اشخاص علی گڑھ آئیں اور علی گڑھ کے ہو جائیں۔ کسی معقول اجنبی شخص بالخصوص نوجوان طالب علم سے ملاقات ہوتی تو اسے مشورہ دیتا جو کبھی کبھی اصرار کی حد تک پہنچتا کہ وہ ذاکر صاحب سے مل آئے۔ یہ اس بنا پر ہوتا کہ جب اس نوجوان نے مجھے اس درجہ خوش کیا ہے تو اپنی طرف سے ویسا ہی تحفہ بھی پیش کروں گا۔ یہ تحفہ اس کی ذاکر صاحب کی رہنمائی کی طرف ہوتا۔ آگے چل کر ان اشخاص کو بھی مشورہ دینے لگا جو مذہب، معاشرہ، سیاست ہی سے نہیں خود ذاکر صاحب سے برہم و بیزار ہوتے۔ یہ لوگ ذاکر صاحب سے مل کر آتے تو بالکل بدلے ہوئے ہوتے انہوں نے ذاکر صاحب ہی کو نہیں اپنی اچھی صلاحیتوں

کو بھی پا لیا ہو۔ لیکن یہ مشورہ جتنا نوجوانوں پر کارگر ہوتا اتنا ہی ان لوگوں پر بے اثر ہوتا جن کو اعلیٰ اقدار کو ادنیٰ اغراض پر قربان کر دینے کے لیے نفس کا ادنیٰ سے ادنیٰ مطالبہ کافی ہوتا ہے۔ کبھی یہ اور اتنا بھی نہیں۔ عموماً یہ وہ لوگ ہوتے جو اپنے کو مذہب سے جتنا قریب جتاتے مذہب ان سے اتنا ہی دور تر ہوتا۔ مذہب کی بڑائی کا ہمیشہ قائل رہا، ایسا نہ کروں تو اپنی کس خوبی پر بھروسہ یا فخر کر سکوں گا، لیکن اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ مذہب دراصل اتنا کسی کو بناتا یا بگاڑتا نہیں جتنا اس کو بے نقاب کر دیتا ہے۔ کم سے کم آج کل کے مسلمانوں میں تو یہی دیکھنے میں آ رہا ہے بالخصوص ایسے مسلمانوں میں جو مذہب کے کاروبار نفع و نقصان کے خطوط پر کرتے ہیں۔ نفع اپنا، نقصان مذہب کا یا چاہے جس کا!

مجھے کسی خاص علم میں درک نہیں۔ اس علم و فن میں بھی جس کے طفیل اب تک روٹی اور عزت کمائی ہے۔ لیکن کسی علم کے اسرار و غوامض سے قطع نظر اس کے بارے میں اتنا اندازہ لگا سکتا ہوں کہ عملاً وہ زندگی اور ذہن کے کن امور سے متعلق ہے مثلاً کمسٹری کے بارے میں موٹی سی ایک بات یہ جانتا ہوں کہ اس سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر لینے کا کام لیا جاتا ہے یعنی ہر مرکب سے اس کے مفردات یا متحولات کس طرح علیحدہ کیے جا سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مذہب یا شخصیت بھی یہی کام انجام دیتی ہے۔ یعنی اگر کسی کو طبیعت اور طینت کا پتہ لگانا ہو تو اس کا سامنا کسی ایسے شخص سے کرا دیا جائے جو اقتدارِ اعلیٰ کا امین و آئینہ دار (مردِ مومن یا مردِ حق) ہو بڑی آسانی سے معلوم ہو جائے گا کہ شخص مذکور اپنی نہاد کے اعتبار سے اخلاقی فضائل سے ممتاز یا نفسیاتی اسقام میں مبتلا ہے۔ موخر الذکر ہر عبرت و عذاب کو جھیل

سکتا ہے نہیں برداشت کر سکتا تو اچھے اور نیکنام شخص کو۔ اس طرح مردانِ حق کسٹری یا کسوٹی ہوتے ہیں جس سے دوسرے پہچان لیے جاتے ہیں۔ اخلاقیات سے بھی اپنے علومِ طبعی، علومِ عمرانی اور کل پرزوں کا علم ہوتا ہے۔

ذاکر صاحب کی رحلت کے بعد اندازہ ہوا کہ کس کس سطح اور طبقے کے کتنے بے شمار لوگ تھے جو ان سے محبت اور ان کا احترام اس بنا پر کرتے ہیں کہ ایسا کرنے سے وہ خود اپنے کو شایانِ شان و قابلِ احترام سمجھنے لگتے تھے۔ ذاکر صاحب قرول باغ میں جس معمولی حیثیت سے اپنے رفیقوں کے ساتھ جامعہ کے کاموں میں مصروف رہتے تھے اس کے بعد جن مراحل سے گزرتے ہوئے صدرِ مملکت کے درجے پر پہنچے وہ کسے نہیں معلوم۔ لیکن جب وہ قرول باغ میں تھے اس وقت جتنے چھوٹے بڑے ان کی طرف بے اختیار کھنچتے اور جھکتے تھے اسی طرح آخری اور بلندی ترین منصب تک وہ مرجعِ خواص و عوام رہے۔ ہر شخص ہر اعتبار سے ان کو معظم و مکرم جان کر ملتا تھا اور اس طرح اور اس لیے ملتا تھا جیسے ملے بغیر رہ نہیں سکتا تھا، نہ یہ کہ ذاکر صاحب ان کے آقا یا حاکم تھے جس سے ان کی روزی، مرتبہ یا آبرو وابستہ تھی۔ کچھ اس طرح کی بات ہوگی کہ ان کی دفعتہً رحلت کی خبر سن کر راشٹرپتی بھون کا مالی روتے روتے بے ہوش ہو گیا اور ان کے سکریٹریٹ کے ایک عہدہ دار پر قلب کا دورہ پڑا۔ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ذاکر صاحب ایک منصب سے دوسرے منصب پر فائز ہوتے تو انکے اسٹاف کے افراد دل میں خواستگار ہوتے کہ ذاکر صاحب ان کو اپنے عملے میں لے لیں ان میں سے بعض دوڑ دھوپ کر کے اس میں کامیاب ہو جاتے۔ ذاکر صاحب اپنی مرضی یا مصلحت کی بنا پر کسی کا انتخاب کر لیتے تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہ ہوتی اس لیے کہ بڑے بڑے عہدہ دار ایسا کیا کرتے ہیں اور ایک طور پر

یہ حاکم کا حق سمجھا جاتا ہے۔ غیر معمولی بات یہ ہوتی کہ عملہ اس کا متمنی ہو کہ ذاکر صاحب کی شفقت میں کام کرنے اور زندگی بسر کرنے کا موقع نصیب ہو۔

گذشتہ ۲۰۔ بائیس سال سے تادمِ واپسیں ذاکر صاحب کی خدمت بہر صورت و بہر حال جتنی میاں اسحٰق نے کی وہ کسی اور نے نہیں کی۔ خلوص کی، خاموش شبانہ روز، غیر منقطع خدمت جو نہ اعزا و احباب کے بس کی تھی نہ دولت و اقتدار کی نہ کسی اور کے۔ یہ شغف و سپردگی ائمہ دین کے مریدانِ باصفا یا خادمانِ خاص میں البتہ سنی اور دیکھی گئی ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن مالٹا میں اسیر تھے تو سردی کے زمانے میں تہجد کی نماز ادا کرنے کے لیے مولانا حسین احمد مدنی لوٹے میں پانی بھر کر اپنی گود میں لے لیتے تھے جب گرم ہو جاتا تو مرشد کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ اس واقعہ کی شیخ الہند کو شائد کبھی خبر نہیں ہوئی۔ کچھ اسی طرح کا حال میاں اسحٰق کا ذاکر صاحب کے ساتھ رہا۔ یہ ۱۹۴۸ء میں ذاکر صاحب کو من جملہ اسباب وائس چانسلری علی گڑھ میں دستیاب ہوئے۔ اس سے پہلے ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کی خدمت میں تھے اور اپنے فرائض اس لگن سے بجا لاتے تھے کہ ذاکر صاحب نے ایک بار کہا تھا کہ اسحٰق جس طرح ڈاکٹر ضیاء الدین کی خدمت کرتے ہیں صرف اسی کے صلے میں ان کی بخشایش مسلّم ہے ان کو کسی اور عبادت کی یا کارِ خیر کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں عموماً یہ ہوتا کہ کم سے کم نوش پر اور کبھی کبھی ایسا کرتا بھی بھول جاتے دعوت یا پارٹی دے ڈالتے اور مہمان چاہے جتنے ہوں خورد و نوش کا سامان کم سے کم ہوتا۔ اسی طرح وہ ہندوستان کے اندر یا باہر کے سفر پر جلد سے جلد بغیر کسی اہتمام کے بے سامان گمان روانہ ہو جاتے۔ اس زمانے میں مشہور تھا کہ ڈاکٹر صاحب سے زیادہ اور اچانک،

سفر کرنے والا ان کے درجہ کا کوئی دوسرا نہ تھا۔ یہ ذمہ داریاں اسحٰق کی تھی کہ پارٹی بھی کامیاب رہے اور سفر میں بھی کوئی خلل نہ آئے۔ اسحٰق نے کبھی ان تقریبوں کو حادثے میں تبدیل ہونے نہ دیا وہ جتنا کام کرتے اتنا ہی خاموش اور پرسکون رہتے۔ دوسروں سے کام کم لیتے تھے خود زیادہ کرتے تھے۔ ان کو کام کرتے ہوئے دیکھیے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی بڑے کارخانے میں کوئی بڑی مشین پورے طور پر برسرِ کار ہو اور کہیں سے بے آہنگ نہ ہو۔ مشیتِ الٰہی کی کسے خبر، کیا عجب میاں اسحٰق کو خلوص و خدمت کی جو تربیت ڈاکٹر ضیاء الدین کے ہاں ملی ہو وہ بالآخر ذاکر صاحب کی آسائش، صحت و سلامتی کے لیے تقدیر تھی۔

علی گڑھ آتے ہی کچھ دنوں بعد ذاکر صاحب پر دل کا دورہ پڑا اس زمانے میں اپنے آرام یا تکلیف اور نفع نقصان سب سے منہ موڑ کر میاں اسحٰق نے ذاکر صاحب کو ہر زحمت سے بچانے اور ہر راحت کے پہنچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ ہمہ وقت ذاکر صاحب کے سامنے یا آس پاس موجود ہوتے۔ معالج کہتے کہ دوا علاج سے زیادہ میاں اسحٰق کی خدمت اور تیمارداری ذاکر صاحب کے لیے مفید و مبارک ثابت ہوئی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان کو وہم سا ہو گیا تھا کہ ذاکر صاحب کی دیکھ بھال کو کسی دوسرے پر چھوڑ دیا گیا تو ان کو نقصان پہنچ جائے گا جس کے لیے وہ (میاں اسحٰق) ذمہ دار ٹھہریں گے۔ ذاکر صاحب کے بعض ملنے والوں نے اس پر آزردگی کا بھی اظہار کیا کہ ان کو دیکھنے یا ان سے ملنے کے لیے معالج کی نہیں بلکہ اسحاق کی اجازت لینی پڑتی تھی۔ دوا اور غذا منٹ منٹ کی پابندی سے دیتے۔ ناشتہ اور کھانا اپنے ہاتھ سے تیار کرتے۔ کمرے کی صفائی بستر کی درستی، گلدان میں پھولوں کا ردوبدل، ذاکر صاحب کو سہارا دے کر اٹھانا بٹھانا غسل خانے سے متعلق تمام امور کا انصرام کلیتہً اپنے ہاتھ میں رکھتے ذاکر صاحب کو نیند نہیں آتی تھی سونے کا وقت آتا تو تلووں پر مالش کرنے کے لیے تیل

لے کر پہنچ جاتے اور جب تک اطمینان نہ ہو جاتا کہ نیند آ گئی اپنا شغل جاری رکھتے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ معمولی آہٹ پر نمودار نہ ہو جاتے ہوں ذاکر صاحب کو شکر آتی تھی میاں اسحٰق نے اس کو جانچنے کا طریقہ سیکھ لیا تھا ہر صبح قارورے کی رپورٹ، دواؤں کے نسخے، تشخیص کے تمام چارٹ پیش کر دیتے اور رات بھر کی کیفیت معالج کو سنا دیتے اور اس کی ہدایات کے مطابق دن کا پروگرام مرتب کرتے۔ خود بیمار رہوں یا بیوی بچے ان کے اپنے گھر کے جھگڑے جھمیلے ہوں یا کچھ اور میاں اسحٰق شاید ہی کبھی ذاکر صاحب سے علیحدہ ہوئے ہوں۔ وہ اس طور سے ذاکر صاحب سے وابستہ ہو گئے تھے کہ ان کو دیکھ کر معلوم ہو جاتا کہ ذاکر صاحب کس حال میں ہیں۔ بارے خدا نے شفا دی اور ذاکر صاحب یونیورسٹی کے کاموں میں اس طرح منہمک ہو گئے جیسے اس سے پہلے ایسے خطرناک مرض میں مبتلا نہیں ہوئے تھے۔ ذاکر صاحب کے زمانے میں وائس چانسلری کی کوٹھی پھوس کی تھی جو سرسید سے پہلے عہد کی یاد دلاتی تھی۔ جون میں علی گڑھ مسلسل پیلی آندھیوں کی زد میں ہوتا تو اس کوٹھی کے اندرون اور بیرون میں بہت کم فرق رہ جاتا ایک رات ذاکر صاحب کے یہاں ڈنر تھا۔ کھانا ختم ہی ہوا تھا کہ ٹیلیفون آیا کہ کچھ اکابر دوسرے دن صبح سات بجے علی گڑھ پہنچیں گے اور بریک فاسٹ کھانے کے بعد آگے بڑھ جائیں گے۔ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ گرد و غبار کا شدید طوفان آیا اور دو گھنٹہ وہ سب ہوتا رہا جس کی زد میں کوئی شخص دیر تک نارمل نہیں رہ سکتا تھا۔ میاں اسحٰق کو بریک فاسٹ کی اطلاع دے دی گئی۔ انہوں نے اسی خاموشی، اطمینان اور غیر جانبداری کے انداز سے سنا جو ان کا اسٹائل تھا۔ تھوڑی دیر بعد سائیکل اور جھولا سنبھالا اور شہر کو روانہ ہو گئے۔ رات گئے معلوم نہیں کب تک کہاں کہاں کی خاک چھانی اور کن دوکانداروں سے رابطہ قائم کیا اور ضروری اشیاء لے کر واپس آ گئے۔ جو چیزیں باورچی خانے میں تیار کرنی تھیں وہ کیں۔ تمام رات کمرے

جھاڑتے صاف کرتے رہے۔ سب کچھ بذاتِ خود اور بدست خود۔ صبح دیکھا گیا تو ایسا معلوم ہوا جیسے رات طوفان نہیں بادِ صبا آئی تھی اور اپنے ہمراہ صفائی، ستھرائی، خوشگوار فضا اور بریک فاسٹ ساتھ لائی تھی۔ سارا سماں دیکھ کر ایک صاحب نے فرمایا ذاکر صاحب، معلوم ہوتا ہے رات آپ کی کوٹھی طوفان کی زد میں نہیں آئی۔ ذاکر صاحب نے فرمایا۔ کوٹھی تو زد میں آئی لیکن طوفان کی بدنصیبی کہ وہ خود الحق کی زد میں آگیا

دہلی میں ذاکر صاحب سے کبھی ملنا ہوتا تو یہ کسی طرف سے نمودار ہو جاتے۔ ذاکر صاحب کے کہے بغیر لیکن ان کی خواہش اور خوشی کے عین مطابق، فواکہات لاکر سامنے رکھ دیتے اسی ادب اور آداب سے، جس میں مزید آمیزش خلوص و محبت کی ہوتی، جو بڑے سے بڑے سرکاری اور غیر سرکاری مہمان کی مدارات کے پیش نظر ملحوظ رکھے جاتے ہیں۔ اس پر خوش کہ ذاکر صاحب سے ملنے آیا اور ذاکر صاحب کو ان کی حفاظت و امانت میں پایا میرے لیے اچھی سے اچھی کھانے کی چیزیں ایک ٹوکری میں پیک کر کے ساتھ کر دیتے اس فخر سے ذاکر صاحب کو جیسے میرے ساتھ ایسا ہی سلوک کرنا چاہیے تھا۔ تحفہ پانے کی مجھے کیسی خوشی ہوگی اور سب سے بڑی بات یہ کہ ذاکر صاحب نے یہ سلوک مجھ سے انکی معرفت کرایا۔

ذاکر صاحب نے علی گڑھ سے باہر ملک اور حکومت کی دوسری اہم ترین ذمہ داریاں سنبھالیں۔ کتنے دور دراز کے ملکوں کا آئے دن سفر کرتے رہنا، کتنے نئے مسائل اور ان کے نازک و مشکل تقاضوں سے دوچار ہوتے رہتے ہوں گے۔ جن کا اثر ان کی کمزور صحت پر پڑتا ہوگا۔ ان کی غیر معمولی، اخلاقی، علمی، ذہنی اور دوسرے اعلیٰ صلاحیتوں کی عالمگیر شہرت نے ان پر طرح طرح کی ذمہ داریاں عائد کر رکھی ہیں۔ وہ محض صاحب منصب نہ تھے۔ جس کے چھوٹے بڑے بندھے ٹکے فرائض سکریٹریٹ کے کمپیوٹرس کرتے رہتے ہیں اور روزانہ کے کاموں کی خانہ پری ہوتی رہتی ہے میاں الحق ذاکر صاحب کے اس تمام سفر و سیاحت میں سایہ کی طرح ساتھ ہوتے۔ اور ان کی راحت اور کلفت کو

اس طرح بانٹتے رہنے کی فکر میں رہتے کہ ذاکر صاحب کے حصہ میں صرف راحت آئے اور ان کی ساری کلفتیں یہ جھیلتے رہیں۔ ذاکر صاحب سفر میں ہوتے تو متعلقین اور مخلصین کو اس کا یقین اور اطمینان رہتا کہ صدرِ مملکت کے شایانِ شان شروع سے آخر تک ہر منزل اور موقع پر حفاظت، منزلت اور راحت کے تمام ممکنہ انتظامات اپنی نیز میزبان حکومتوں کی طرف سے مکمل ہوں گے۔ لیکن میاں اسحٰق کے ساتھ ہونے سے گھر والوں کو اس کی بھی تقویت رہتی اور یہ کوئی معمولی تقویت نہ تھی کہ ذاکر صاحب کی خدمت اور رفاقت کے لیے ان کا اور سارے گھر کا معتمدِ خاص بھی ساتھ ہے جو کسی رشتہ دار سے کم نہ تھا، بعض اعتبار سے زیادہ ہو تو عجب نہیں۔

مصالحِ مملکت کے پیشِ نظر، پہلے زمانے کے سلاطین و صنادید کی علالت کبھی کبھی رحلت تک کی خبر حتی الوسع راز میں رکھی جاتی تھی۔ آج کل کے ڈکٹیٹرس کی بھی۔ شاید اسی روایت کا لحاظ رکھتے ہوئے میاں اسحٰق نے کبھی نہیں بتایا کہ ذاکر صاحب کی طبیعت خراب ہے ناساز بھی ہوئی تو یہی بتاتے کہ اللہ کا فضل ہے۔ ذاکر صاحب کے متعلقین، راشٹرپتی بھون کے عمال، وہاں کی تقریبوں کی تفصیل ملاقاتیوں کی آمد و رفت، صدرِ مملکت کے ایوان کے کسی چھوٹے بڑے واقعہ کا ذکر شاید ہی کبھی کرتے ہوں۔ ایسی نزاکت کا سامنا ہوتا تو "بخود خلید و ہیچ نہ گفت" پر عمل کرتے۔ ان کی عام خاموشی، ایک طرح کا مستقل رکھ رکھاؤ اور اپنے کاموں میں مسلسل مشغولیت ان کو زبان اور کان کے ہر طرح کے فتنے سے محفوظ رکھتی۔ آج تک وہ کسی اسکینڈل کے راوی ہوئے نہ ریویوران میں یہ اتنی بڑی فضیلت ہے کہ کتنے فضیلت مآب ان سے آنکھ نہیں ملا سکتے!

آخر وہ دن اور وقت آگیا جو سب کو پیش آنے والا ہے سو اس کے جس کے ہاں زمان ہے نہ مکان، صرف اختیار ہے اور اقتدارِ جانِ آفریں کو اپنی امانت

واپس لینے کا ذاکر صاحب کو دفعتہً پیغام آیا۔ اس وقت بھی میاں اسحٰق غسل خانے سے لگے باہر کھڑے تھے۔ ان کو اس کا احساس تھا کہ معلوم نہیں کب تک کہاں ذاکر صاحب کو ان کی ضرورت پڑے۔ اس لیے جہاں تک ممکن ہوتا وہ محافظ فرشتے کی مانند ذاکر صاحب کے آس پاس ہی رہتے۔ چنانچہ سب سے پہلے روح سے جدا جسد و جسم کو اسحٰق ہی نے دیکھا، چھوا اور بے قراری و محرومی کے بے اماں احساس کے ساتھ دعائے مغفرت کی چادر میں لپیٹ لیا۔ جب تک میت گھر پر رہی اور تیسرے دن جب سپرد خاک کی گئی، حاضر غائب لحظہ بلحظہ دیکھ بھال کرتے اور اس پر نثار ہوتے رہے جیسے ابھی ابھی ان کے تلووں پر تیل کی مالش کر کے اٹھے ہوں اور ذاکر صاحب کی آنکھ لگ گئی ہو۔ راشٹرپتی بھون سے قبر کے کنارے تک پھولوں سے ڈھکے ہوئے جسم اور کھلے ہوئے چہرے پر مسلسل کئی گھنٹے کھڑے کھڑے پنکھا جھلتے اور مٹی کو گرد اور گرمی سے بچاتے ہوئے پہنچے۔ یہاں تک کہ ذاکر صاحب کو ہر طبقہ کے بیشمار ماتم گساروں کے یاس و الم اور دعائے مغفرت کے ہجوم میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ میاں اسحٰق کے اعصاب نے تین دن تک اس مسلسل فشار کو بالخصوص راشٹرپتی بھون سے جامعہ ملیہ تک، جہاں تدفین عمل میں آئی کس طرح برداشت کیا، کتنا عجیب کرشمہ ہے۔ کون جانے احساسات کے تانے بانے پر بنے ہوئے انسان میں یہ توانائی کہاں سے آئی!

جب سے اسحٰق ذاکر صاحب سے وابستہ ہوئے ہیں نے ان سے زیادہ کسی اور کو ذاکر صاحب کے ساتھ اور ان کے قریب نہیں پایا۔ چنانچہ ذاکر صاحب کے نزدیک ترین عزیزوں اور دوستوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے تو اتنا خیال ذاکر صاحب کی طرف نہیں جاتا جتنا اسحٰق کو دیکھتے ہی ذاکر صاحب یاد آجاتے ہیں اور ایک بار پھر پچھلی یادیں دور تک جگمگاتی چلی جاتی ہیں۔ جیسے ماضی کے ستونوں کی طویل قطار پر

بجلی کے قمقمے سرِ شام یکے بعد دیگرے چشم زدن سے بھی کم وقفوں کے ساتھ روشن ہوتے ہوئے ماضی کی تاریک، اور پراسرار خاموشیوں میں غروب ہو جاتے ہوں خدمت اور خلوص کا یہ فیضان تمام دوسرے رشتوں سے کتنا عجیب، کتنا مختلف، اور کتنا گرانبہا ہوتا ہے اس کا اندازہ وہ لوگ کیسے کر سکتے ہیں جن کا قد و قامت خود ان کے بالشت سے بھی کم ہوتا ہے!

اسحٰق نے ذاکر صاحب کی خدمت گذاری میں ماں بہن بھائی اولاد سب کی شفقت، محبت، ممتا اور جاں نثاری کا حق ادا کر دیا۔ آج وہ اس احساسِ محرومی و مفارقت میں بھی برابر کے شریک ہیں جن سے اراکینِ خاندان دوچار ہیں۔ شب و روز کی اپنی مسلسل خاموشی خیر خواہی اور احساسِ ذمہ داری سے۔ کون کہتا ہے دنیا سے رسمِ وفاداری اٹھ گئی۔

ذاکر صاحب کی تصانیف، تراجم اور لکچرز پر اربابِ فکر و فن نے شرح و بسط سے اظہارِ خیال کیا ہے ان گراں قدر خیالات پر میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتا۔ یہاں اس کی ضرورت بھی نہیں معلوم ہوتی۔ ذاکر صاحب سے اکثر فرمایش کرتا کہ اپنی زندگی اور ہم عصروں اور ہم سفروں کے بارے میں کچھ لکھ ڈالیں۔ یہ بھی عرض کرتا کہ یہ اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ اس سے آپ کی شہرت میں اضافہ ہوگا البتہ اس کا یقین ہے کہ اردو میں جو چیز آپ لکھ دیں گے وہ اس صنفِ ادب میں بے نظیر ہوگی اور علی گڑھ کی طرح میں اردو کو بھی بے نظیر ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔ بات کچھ آگے چلی تو عرض کیا کہ اردو جس حال کو پہنچ گئی یا پہنچا دی گئی ہے اس کے باوجود میرا خیال ہے کہ جو چیز بے نظیر ہوگی وہ دنیا کے کسی اچھے شعر و ادب میں کم بے نظیر نہ ہوگی میری اس طرح کی گرم گفتاری یا بے اختیاری پر ذاکر صاحب بالعموم مسکرا دیتے یہ

مسکرانا اس طرح کا ہونا جیسے میرا کہنا بھی درست تھا اور اس کا نہ ماننا جانا بھی درست نہ تھا۔ یہ فرمایش پوری نہیں ہوئی۔ ذاکر صاحب چاہتے بھی تو شاید نہ کر سکتے۔ جس منصبِ عالیہ پر وہ فائز تھے اور جن پر وہ رہ چکے تھے اور طرح طرح کی جن ذمہ داریوں کا سامنا تھا اس میں کوئی ایسا بیان دینا جس سے کسی فتنے کے اٹھ کھڑے ہونے کا امکان ہو قرینِ مصلحت نہ تھا۔ وہ اپنے بے شمار ملنے والوں اور رفقا میں سب کو قابلِ اعتبار و احترام نہیں سمجھتے تھے۔ شاید کوئی بھی نہیں سمجھتا۔ سرگزشت لکھنے میں اس طرح کی نزاکتیں قدم قدم پر پیش آتی ہیں۔ چنانچہ ذاکر صاحب نے وہی کیا جو ہمیشہ سے کرتے آئے تھے یعنی جھگڑنے سے جھیلنے کو بہتر سمجھا۔ یوں بھی جب ہر طرف بارود بچھی ہو اس وقت شرر یا شرر بردونوں سے دور رہنا اور دوسروں کو رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہر شخص بقدرِ استعداد و ظرف قدرتی طور پر اس کا اظہار کسی نہ کسی شکل میں کسی نہ کسی وسیلے سے کرے اور اس کے تاثرات و تجربات میں اس کا کوئی شریک ہو اور ان کی تصدیق کرے۔ جو لوگ خلوص و خدمت کی زندگی بسر کرتے ہیں وہ ایک طور پر مامور من اللہ ہوتے ہیں۔ ان کی پیروی و تصدیق خیر و برکت کی محرک و موجب ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب کی پوری زندگی ایسی ہی تھی۔ ان کی سرگزشت اچھے اور برے لوگوں کے اچھے اور بڑے کاموں میں ہمیشہ تصنیف ہوتی رہے گی!

ذاکر صاحب نے اپنی سرگزشت نہیں لکھی لیکن جس کام کے لیے وہ شعوری طور پر آمادہ نہیں ہوئے ان کے اعلیٰ فکر و عمل کے تقاضوں نے ان سے غیر شعوری طور پر کرا لیا۔ انہوں نے ایک قصہ لکھ ڈالا۔ کچھ دن ہوئے اس کا مسودہ میں نے پڑھا تھا۔ تفصیل یاد نہیں رہی لیکن اس کے تاثرات ذہن کے پردوں پر طرح طرح کے نقش و نغمے میں ابھرتے رہتے ہیں۔ قصہ کچھ وے اور

خرگوش کی دوڑ اور فتح و شکست کا ہے جس کو معلوم نہیں کب سے ہم اپنے اب وجد سے سنتے چلے آرہے ہیں اور آنے والی نسلیں رہتی دنیا تک سنتی اور سناتی رہتی رہیں گی اس فرق کے ساتھ کہ وہ قصہ بچوں کے لیے تھا۔ ذاکر صاحب نے اس کا رخ بچوں کے بزرگوں کی طرف پھیر دیا ہے۔ پرانی شراب کو بوتلوں میں نہیں پیش کیا ہے جیسا کہ ایسے موقع پر کہہ کر فارغ ہو جایا کرتے ہیں، بلکہ پرانی شراب کو نیا نشہ اور نئے میکش و مے خانے دیے دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ نئی نسل کو نئی نگاہ بخشی گئی ہے۔ ذاکر صاحب نے اس قصے کا جو قصہ لکھا ہے اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جس تصنیف کا تعارف کراتے ہیں اس سے اس کی کتنی وقعت بڑھ جاتی ہے! اکثر یہ طے کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ ذاکر صاحب کا یہ احسان کس پر زیادہ ہے مصنف پر یا اس کے پڑھنے والے پر جمہوریہ فلاطون کا انہوں نے جو اردو ترجمہ کیا ہے اس کے مقدمے کو پڑھ کر یہی احساس ہوتا ہے۔ زیر نظر تصنیف کو تمثیل، افسانہ، کہانی جو چاہے کہہ لیجئے۔ بہتر اور صحیح تر یہ کہنا ہوگا کہ یہ "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" کی مصداق ہے۔ بڑا فن کار دراصل وہ ہے جس کے فن پارے میں ہر فن کے حاصل اور حسن کی جلوہ گری ملے۔ اسی کو "فن کار اعظم" اور اس کی قدرت کے قریب ہونا کہتے ہیں جو ہر فن کار کا منتہائے نظر اور مقصد اعظم ہوتا ہے!

قصے کا مکان و مقام نواح جامعہ ملیہ ہے۔ اس سے متصل دور تک پھیلی ہوئی جمنا کی آب رواں کی صاف و شفاف چادر اور ریت کا لہریے دار رقبہ ہے۔ جگہ بڑی سکوت افزا، خوبصورت اور صحت بخش ہے۔ یہاں جامعہ کے اساتذہ اور طلبا صبح شام سیر کرنے جایا کرتے تھے۔ دہلی سے بھی لوگ فرصت منانے اور خوشوقت ہونے کے لیے آیا کرتے ہیں۔ ایک دن جامعہ کے ایک مولوی صاحب کی ملاقات ایک سال خوردہ کچھوے سے ہوگئی جو ریتی پر ایک طرف کسی گہری سوچ اور حیرانی میں

بیٹھا ہوا تھا۔ مولوی صاحب سے صاحب سلامت ہوتی ہے۔ مولوی صاحب کی چاک و توجہ سے ہمت افزائی ہوئی تو کچھوا ڈرتے ڈرتے پوچھتا ہے، مولبی صاحب بہت دنوں سے ایک کرید پیدا ہوگئی ہے جس سے نہ دن کو چین ہے نہ رات کو۔ آپ بڑے ودوان ہیں کوئی اپائے بتائیے۔ مولوی صاحب ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں تو بڑے تردد سے پوچھتا ہے، مولبی صاحب پرکھوں سے سنتا آرہا ہوں کبھی کچھوے اور خرگوش کی دوڑ ہوئی تھی۔ کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ آپ بتائیے جیت کس کی ہوئی تھی۔ مولوی صاحب سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔ ایک طرف کچھوے کی مدد کرنا چاہتے ہیں دوسری طرف اس کے سوال کا جواب اپنے بس کا نہیں پاتے لیکن ایک سادہ دل اور بہادر انسان کی مانند مشکلات کو خاطر میں لائے بغیر انہوں نے کچھوے کے دردِ سر کو اپنا دردِ سر بنا لیا۔ پھر جیسے مایوسی کے گھور اندھیرے میں کوئی جگنو چمک گیا ہو۔ بڑے اعتماد اور افتخار کے لہجے میں بولے، اطمینان رکھو ہمارے یہاں ایک سے ایک ودوان رہتے ہیں۔ کل صبح سویرے یہاں لاؤ گا وہ تمہارا اطمینان کرا دیں گے۔ کچھوا مطمئن ہوگیا۔ دوسرے دن صبح کو مولوی صاحب نے اپنے یہاں کے عالموں سے ایک کو ساتھ لے چلنے پر آمادہ کیا۔ کچھوا اپنی جگہ پر مجسم انتظار و انکسار بیٹھا ہوا ملا۔ مولوی صاحب نے تعارف کرایا۔ کچھوے نے ہاتھ جوڑ کر بڑے ادب اور عاجزی سے اپنا سوال پیش کیا۔ عالم نے کچھوے کے سوال اور اس کی پریشانی کو نظر انداز کر کے اپنے علم کے سمندر اور اپنی شناوری پر خطبہ صدارت شروع کر دیا۔ کچھوے کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ موقع پا کر بڑی لجاجت سے اپنا سوال دہراتا تو عالم چراغ پا کر طوفان تکلم کو مہمیز کر دیتا۔ کچھ دیر بعد عالم چلے گئے۔ کچھوے نے بڑے دکھ اور مایوسی سے مولوی صاحب سے پوچھا، مولبی صاحب کیا یہ ودوان مجھ سے یا میری باتوں سے ناراض ہوگئے۔ مولوی صاحب کو بڑی ندامت اور اتنا ہی غم ہوتا ہے لیکن کچھوے کو دلاسا

دیتے ہوئے کہتے ہیں، مایوس نہ ہو کل دوسرے ودّوان کو لاؤں گا۔ وہ تمہاری مشکل آسان کردیں گے صبح کو یہیں ملنا۔ دوسرے دن مولوی صاحب دوسرے علم کے ایک عالم کو لے جاتے ہیں۔ کچھوا بدستور اپنی جگہ پر امید لگائے بیٹھا ہوا ملا۔ آج بھی وہی حادثہ پیش آتا ہے جو کل آیا تھا۔ کچھوے کی مایوسی بڑھتی جاتی ہے لیکن مولوی صاحب کی امید اور عزم بڑھتا جاتا ہے۔ وہ ہر شام کچھوے کو دلاسا دیتے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ دوسری صبح کوئی شان و شہرت کا ودّوان لائیں گے۔ صبح ہوتی ہے نئے ودّوان آتے ہیں، مولوی صاحب بڑی امید اور ارمانوں کے ساتھ ان کے ہمراہ ہوتے ہیں لیکن کچھوے کی شام کی صبح نہیں ہوتی یہاں تک کہ ایک ایک کرکے سارے ودّوان اور ان کے واکھیان ختم ہو جاتے ہیں یہاں سے اب یاد نہیں رہا ہے[1] کہ کیا ہوا جس کے بعد کچھوے اور خرگوش کی دوڑ ہوئی۔ کچھوا پیچھے رہ گیا اور خرگوش چھلانگیں مارتا چھلانگیں بھرتا مقررہ نشان پر پہنچ گیا جو ایک زمیندار کا سرسبز، شاداب لہلہاتا ہوا باغ اور کھیت تھا، وہاں پہنچ کر کبھی گھاس کترتا کبھی ترکاری کی کیاری میں تھرکتا اور طرح طرح سے اظہار خرّمی کرتا۔ دفعتہً ایک طرف سے زمیندار کا لڑکا اپنے شکاری کتے کے ساتھ نمودار ہوا۔ کتے نے جھپٹ کر خرگوش کا گلا دانتوں میں لیکر

---

[1] ذاکر صاحب کی وفات کے بعد کئی بار کوشش کی کہ اس تصنیف کا مسودہ تھوڑی دیر کے لیے سرسری طور پر دیکھنے کو مل جائے تاکہ جو باتیں یاد رہ گئی ہیں یا یاد آتی رہتی ہیں ان کی صحت یا عدم صحت کی طرف سے اطمینان ہو جائے اور جو یاد نہیں ہیں وہ یاد آجائیں لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اس وجہ سے اگر ان سطور میں کہیں کوئی غلط بیانی یا اخذِ نتائج میں کوئی نقص راہ پا گیا ہو تو معاف فرمایا جائے یہ بھی ممکن ہے کہ بعد میں وقتاً فوقتاً ذاکر صاحب نے کہیں کہیں طویل یا مختصر حذف اضافے یا ترمیم سے کام لیا ہو جس کی مجھے خبر نہ ہو۔ اس ڈرامے کا ذکر اس لیے کرنا پڑا کہ اس میں اس سرگزشت کی (جو نہیں لکھی گئی) بہت سی باتیں سرِ دبراں اور حدیثِ دیگراں کے راستے سے آگئی ہیں۔ سرگزشت سے ذاکر صاحب کے فضائل پر روشنی پڑتی، اس تصنیف سے ان کے فضائل کا روشنی کا منارہ سامنے آتا ہے۔

جھٹکا دیا اور خرگوش بے جان ہو کر کتے کے منھ میں لٹک کر رہ گیا۔ یہ منظر دیکھ کر کچھوا کرب سے بلبلا اٹھا اور بولا "ارے یہ کیا ہوا، یہ تو میں نے نہیں چاہا تھا!" ڈرامہ ختم ہو گیا۔

اس کا اطمینان نہیں ہے کہ ذاکر صاحب نے ڈرامے کے تمام مناسبات اور جزئیات کا لحاظ رکھتے ہوئے جو باتیں جس طرح پیش کی ہیں اور سطر سطر میں ان کی بے مثل قدرتِ تحریر طنز و طباعی اور حقائق کے عرفان و احترام کی جو مثالیں ملتی ہیں اس کا خاطر خواہ تعارف کرا سکا ہوں۔ میرے لیے یہ آسان بھی نہ تھا اس لیے کہ مجھے ڈرامے کی تاریخ سے واقفیت ہے نہ اس کی تکنک اور نزاکتوں کا علم۔ لیکن اس ڈرامے کے مطالعہ سے اس کا احساس ضرور ہوا کہ یہ فن کتنا اہم، کتنا مشکل اور ممکنات مہمہ سے کس درجہ لبریز ہے۔ نیز یہ کہ اردو میں ڈرامے کے اچھے نمونے کتنے کم ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ طربیہ ہو یا المیہ ڈرامے کا کرائسس بتدریج بڑھتا رہتا ہے۔ اسی اعتبار سے انجام کی خبر اور خطوط واضح ہونے لگتے ہیں۔ ذاکر صاحب کے اس ڈرامے کا امتیاز جو بہت کم ڈراموں میں نظر آئے گا یہ ہے کہ آخر کی دو تین سطروں سے پہلے تک کوئی نہیں کہہ سکتا کہ بظاہر ایسا ہلکا پھلکا طربیہ ایسے گہرے اور چکرا دینے والے المیہ پر ختم ہو گا۔

جس طرح اس ڈرامے کی جان کچھوے کا یہ فقرہ ہے "ارے یہ کیا ہوا، یہ تو میں نے نہیں چاہا تھا" اسی طرح ڈرامے کا آخر پڑھ کر پڑھنے والا بے اختیار کہہ اٹھے گا۔ "ارے یہ کیا ہوا یہ تو میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا۔" ذاکر صاحب کی اس تصنیف نے اردو ڈرامے کو اوّل اور آخر ایک ہی کوشش میں اردو غزل کے معیار تک پہنچا دیا۔ کیا کروں میری طبیعت فن اور فن کار کو اکثر اردو غزل کی میزان میں تولنے پر مائل رہتی ہے!

سچائی بہت سہل اور سادہ ہوتی ہے ایسی نہ ہوتی تو ہر شخص کو بتایا کیسے جا سکتا اور وہ سمجھ کیوں کر پاتا کہ سچائی کتنی ضروری ہے اور اس پر عمل کرنا چاہیے لیکن اس

کی تلاش و تصدیق اتنی ہی مشکل ہے۔ مثلاً شیان کی تقدیر اسی کی شہادت دیتی ہے ڈرامے کا مرکزی اور بنیادی کردار کچھوے کا ہے۔ کتنا مختصر سیدھا سادا کیریکٹر ان صفات اور اتنی ہی سی صفات کا ہیرو شاید ہی کسی اور ڈرامے میں نظر آئے۔ وہ اس حقیقت کی تلاش میں ہے کہ مقابلہ کیا ہے، ہار جیت کسے کہتے ہیں، ایسا کیوں ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ کیا ہونا چاہیئے۔ تجسس اور تفتیش کی اس مہم کا آغاز وہ بڑی مسکنت اور انکسار سے کرتا ہے۔ اس کا بڑا خیال رکھتا ہے کہ اس سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے، کوئی آزردہ نہ ہو۔ اس کا گمان بھی ہوتا ہے تو وہ تلاشِ حق کو نظر انداز کر کے تالیفِ قلب پر مائل ہو جاتا ہے اور طرح طرح سے معذرت کرتا ہے۔ خرگوش کا المناک حشر دیکھ کر اس پر جو کرب طاری ہوتا ہے اور جو کلمات بے اختیار اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلتے ہیں ان میں کیا اشارے ملتے ہیں، ان مسائل پر بحث کرنے کا حق جن اربابِ فکر و نظر کو پہنچتا ہے ان میں میں نہیں ہوں۔ البتہ اس آواز کی گونج سے کان آشنا معلوم ہوتے ہیں جیسا کہ فانی نے کہا ہے۔

آواز آ رہی ہے کب کی سنی ہوئی

فانی شاعر تھے وہ غیب کی آواز سن سکتے تھے اور اس کی تعبیر بھی جرأت سے کرتے تھے۔ مجھ عامی کو تو ایسا محسوس ہوا کہ یہ اسی انداز و انتباہ کی آواز تھی جو آج سے ۲۲ سال پہلے دہلی میں شقاوت کی ایک شام کو سنائی دی تھی۔ کیا عجب کہ زیرِ نظر ڈرامے کے ہیرو کی صدائے کرب اسی آواز کی بازگشت ہو جس کی ذاکر صاحب نے اس محبت و حسرت سے یاد دلائی ہے۔

ڈرامے میں ہجوم تو بہتوں کا ہے بالخصوص دو دانوں کا لیکن ممتاز صرف دو ہیں۔ کچھوا اور مولوی صاحب۔ مولوی صاحب کا علم اور عقل دونوں واجبی ہیں۔ جو مسائل ڈرامے میں آئے ہیں ان کا سمجھنا موصوف کے بس کی بات نہیں

لیکن کسی کی تکلیف و تردّد میں کام آنے کے لیے اپنی ساری اچھی صلاحیتیں اور ذرائع و وسائل کو بے دریغ کام میں لانے اور مسلسل ناکامی کے باوجود کوشش جاری رکھنے بلکہ تیز تر کر دینے اور رکھنے کا جیسا ناقابلِ تسخیر جذبہ ان میں ملتا ہے وہ لاجواب و لازوال ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں ان کو کچھوے کا مکمل اعتماد حاصل ہو جاتا ہے۔ کچھوے کی ذہنی خلش ان کی سمجھ میں نہیں آتی لیکن اس کو دور یا کم کرنے کے لیے ان کی تمام تعمیری و اخلاقی صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ جامعہ میں چوٹی کے جتنے ودّوان تھے ان سب کو یکے بعد دیگرے کچھوے کے پاس لے جاتے ہیں کہ وہ اپنے علم کے زور سے کچھوے کی مشکل آسان کر دیں۔ لیکن ان علماء کا بندھا ٹکا، فرسودہ، بے آب و گیاہ و بے برگ و ثمر، غیر منہضم و غیر مربوط علم جو شخصیت کے فیضان سے دور اور محروم رہا ہو، انسانی مسائل کی نہ کبھی تشخیص کر سکا نہ اس کا حل پیش کر سکا۔ صورت حال یہ ہے کہ نہ کچھوے کی تشفی ہوتی ہے نہ مولوی صاحب ہار مانتے ہیں۔ کتنے محدود، ناقابلِ اعتبار و ناقابلِ لحاظ مادّی اور ذہنی وسائل کے ایک فرد کو رفیقِ اعلیٰ کی طرف کتنی لامحدود رفاقت و ہمدردی کی دولت نصیب ہے!

بیچارے کچھوے اور بیچارہ تر مولوی دونوں کے سامنے ودّوانوں نے اپنی اپنی فہم و فراست کا جیسا مولویانہ مظاہرہ کیا اس سے پتہ چلتا ہے کہ آج کل ہمارے علم و عقل اور عقیدے کا معیار یا سطح کیا ہے اور عالموں میں عطائیت اور سطحیت کہاں تک سرایت کر چکی ہے۔ مغربی شعر و ادب کا میں معرف ہی نہیں اس سے مرعوب بھی ہوں لیکن اپنے اچھے سے اچھے "تنقید نگاروں کو مغربی ادب کے نام سے یا اس کی آڑ لے کر جو کچھ پیش کرتے دیکھتا ہوں اور جس طرح ان کے پس رو اپنے شعر و ادب کی عبادت گاہوں پر پتھر پھینکتے ہیں اور

طرح طرح کا فتنہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے، اس سے تفریح بھی ہوتی ہے عبرت بھی! دوسرے اور تیسرے درجے کے تنقید نگاروں سے قطع نظر جو لوگ ہمارے یہاں کے سربرآوردہ تنقید نگار مانے جاتے ہیں، ان کی تحریروں کو بھی دیکھ کر کچھ کم حیرت نہیں ہوتی۔ جب غالب کے زمانے میں پابندیِ رسم و رہِ عام اتنی بڑھ گئی تھی کہ غالب کو اہلِ خرد کو متنبہ کرنا پڑا تھا کہ وہ کس روشِ خاص پہ نازاں ہیں تو آج ان کی صد سالہ برسی کے عہد میں شعر و ادب کا جو معیار رہ گیا ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ کبھی کہیں پڑھا یا سنا تھا کہ ایک من علم کے سمجھنے کے لیے دس من عقل چاہیے۔ اسی طرح کا کوئی فارمولا ہمارے ایسے تنقید نگاروں کے لیے وضع ہونا چاہیے جن کے یہاں دونوں من مانی ہیں! آج کل کے علم و علما کا جو نقشہ اس ڈرامے میں ذاکر صاحب نے کھینچا ہے وہ بڑا دلنشین اور فکر انگیز ہے اس کا اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے کہ جب ہم اس امر کو ملحوظ رکھیں کہ خود ذاکر صاحب کو ان علوم پر کتنا کامل عبور تھا کہ انہوں نے اس خوبصورتی اور مہارت فن سے ان کے عالموں کے مبلغ علم کی نشاندہی کی ہے۔ کسی علم، فن یا فن پارے کی تعریف کرنا آسان ہے اور قابلِ معافی بھی لیکن اس پر نقد و جرح کے لیے اس فنکار سے کافی زیادہ استعداد نہ ہو تو لیے کتنا بڑا جرم ہے۔ اتنا بڑا جرم جس کو حماقت کہتے ہیں!

جس طرح فضا میں خلاء محال ہے اسی طرح اردو ڈرامے (افسانوں میں بھی) عورت اور ۸/۸ ۷/۷ ڈرامے کا بدکردار یا بدخصال) کی عدم موجودگی بھی محال ہے۔ کیسا فن، کیسے فلتے! جیسے عورت اور ویلن قصے کے زد پہیے یا پاور کا کام دیتے ہوں زیرِ نظر ڈرامے میں دونوں میں سے ایک بھی نہیں ہے صرف کچھوا اور مولوی صاحب سب کچھ ہیں لیکن انسانی فضائل کے کیسے کیسے گرانقدر

مسائل و مثالیں ان دونوں کے گرد ابھرتے ہیں اور حل ہوتے ہیں! عورت اور ویلین کی کشش نہ ہونے کے باوجود یہ ڈراما طرح طرح کے ڈرامائی لمحات اور احوال سے لبریز ہے۔ ڈرامے میں شروع سے آخر تک ذاکر صاحب کی پہلو دار شخصیت کی بڑی دلکش جلوہ گری ملتی ہے۔ خفی اور جلی دونوں! اچھے ناول، افسانہ اور ڈرامے میں ہیرو دراصل مصنف خود ہوتا ہے۔ ضابطے کے ہیرو کی حیثیت وجود ظلّی کی ہوتی ہے مسودہ پڑھنے کے بعد ذاکر صاحب سے عرض کیا تھا کہ اگر اس کا عمدہ ترجمہ ملک کی ممتاز زبانوں اور انگریزی میں شائع ہو سکے تو بڑا مفید کام ہوگا۔ انہوں کے علاوہ غیر ممالک کے دانشور بھی اندازہ کر سکیں گے کہ یہ ڈراما ضمیر انسانی کا کتنا سچا اور اچھا ترجمان ہے۔ یہ ایک ایسی تصنیف ہے جو ملک کے ہر اعتبار سے کسی معتبر سفیر کی ہو سکتی ہے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آج تک اچھے سفیر کی ہر ملک کو کتنی ضرورت ہے۔ ذاکر صاحب نے اس کے جواب میں وہی کیا اور کہا جو ایسے موقعوں پر وہ بالعموم کہا یا کیا کرتے تھے جس کی طرف پچھلے سطور میں کہیں اشارہ کر چکا ہوں۔

زندگی کی خوشی اس میں نہیں کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔ خوشی اس میں ہے کہ ہم کتنوں کے رنج و راحت میں اور کتنے ہمارے رنج و راحت میں شریک رہے۔ اسی کو عزت و محبت کی زندگی کہتے ہیں جو صرف انسان کو نصیب ہے۔ زندگی منزل بہ منزل اسی راستے اور روشنی میں ترقی و تہذیب کی اس بلندی تک پہنچی ہے جس سے آج ہم سرفراز بھی ہیں، سرگراں بھی! زندگی کا یہ کارواں کیسی کیسی آزمائشوں سے گزرتا ہوا ہم تک پہنچا ہے اس کا اندازہ ان اچھے اور بڑے لوگوں کی دلسوزی، دانش مندی اور دلیری کی خدمات سے

کیا جا سکتا ہے جنہوں نے ہر خطرہ کا سامنا کیا اور ہر طرح کے مصائب جھیلے لیکن زندگی کے صحیح اور سیدھے راستے سے منہ نہ موڑا۔ اسی سے یہ امید قوی اور قائم ہے اور رہے گی کہ زندگی کیسے ہی تہلکے سے کیوں نہ گزرے تہذیبِ انسان کا منارہ روشن سے روشن تر ہوتا رہے گا۔

ذاکر صاحب ایسے ہی اچھے اور بڑے لوگوں میں سے تھے۔ ان کی عزت و محبت زیادہ سے زیادہ لوگوں کے دلوں میں تھی اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کی محبت و عزت ذاکر صاحب کے دل میں تھی۔ ان سے تکلیف شاید کسی کو نہیں پہنچی، تسلی، تشفی اور تقویت ان سب کو ملی جو ان تک پہونچ سکے۔ خدا ایسے بندوں کو پسند کرتا ہے جو اس کے لاچار بندوں کی دل جوئی کرتے ہیں ان کے حوصلے بڑھاتے ہیں اور اچھی زندگی بسر کرنے میں ان کے معین ہوتے ہیں اس لیے کہ خدا خود ایسا کرتا رہتا ہے۔ اس رول کو ادا کرنے کی توفیق جن بندگانِ محترم کو نصیب ہوتی ہے وہ انسانیت کے محسن قرار پاتے ہیں۔ انہی محسنوں کے ساتھ جریدۂ عالم پر ذاکر صاحب کا دوام بھی ثبت ہو چکا ہے۔ ہر مسلمان اور اچھے انسان کا ایمان ہے کہ خدا کسی کے حسنِ عمل کو ضائع نہیں ہونے دیتا اور وہ خوش اور راضی ہوتا ہے تو اسی کے عطایا کا حد و حساب نہیں رہتا۔ کچھ اور جانتا ہوں یا نہیں۔ اس پر یقین رکھتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ ذاکر صاحب سے راضی اور خوش رہا!

معیاری ادب

	مرتب	لائبریری اڈیشن	طلبہ اڈیشن
مقدمۂ شعر و شاعری	رشید حسن خاں	۳/۴۰	۲/۶۰
انتخابِ سراج اورنگ آبادی	(ڈاکٹر) محمد حسن	۱/۷۰	۱/۲۰
موازنۂ انیس و دبیر	رشید حسن خاں	۴/۲۵	۳/۲۵
انتخابِ مراثی (انیس و دبیر)	رشید حسن خاں	۴/۰۰	۳/۰۰
انتخابِ نظیر اکبر آبادی	رشید حسن خاں	۴/۴۰	۳/۴۵
نیرنگِ خیال (تلخیص)	مالک رام	۲/۳۰	۱/۹۰
فسانۂ آزاد (تلخیص)	(ڈاکٹر) قمر رئیس	۷/۵۰	۶/۲۰
فردوسِ بریں	(ڈاکٹر) قمر رئیس	۲/۶۰	۲/۱۰
شریف زادہ	(ڈاکٹر) قمر رئیس	۳/۰۰	۲/۵۰
حیاتِ سعدی	رشید حسن خاں	۴/۰۰	۳/۲۵
انتخابِ اکبر الہ آبادی	(ڈاکٹر) صدیق الرحمٰن قدوائی	۲/۵۰	۲/۰۰
انتخابِ میر	(ڈاکٹر) محمد حسن	۴/۵۰	۳/۶۰
دیوانِ درد	رشید حسن خاں	۳/۳۰	۲/۷۵
مجالس النسا	صالحہ عابد حسین	۳/۰۰	۲/۵۰
انتخابِ مضامینِ شبلی	رشید حسن خاں	۸/۵۰	۷/۰۰
امراؤ جان ادا	(ڈاکٹر) محمد حسن	۷/۵۰	۶/۰۰
یادگارِ غالب (حصۂ اردو)	مالک رام	۶/۵۰	۵/۵۰
یادگارِ غالب (حصۂ فارسی)	مالک رام	۸/۰۰	۶/۵۰
مثنوی گلزارِ نسیم	رشید حسن خاں	۳/۰۰	۲/۵۰
گذشتہ لکھنؤ	رشید حسن خاں	۱۰/۰۰	۸/۵۰
فسانۂ مبتلا	(ڈاکٹر) صدیق الرحمٰن قدوائی	۶/۰۰	۵/۰۰
انتخابِ ولی	(ڈاکٹر) سید ظہیر الدین مدنی	۳/۰۰	۲/۵۰
افاداتِ سلیم	(ڈاکٹر) خلیق انجم	۶/۳۰	۵/۵۰
توبۃ النصوح	مالک رام	۵/۵۰	۴/۵۰
قصۂ حاتم طائی	اطہر پرویز	۷/۰۰	۶/۰۰
انتخابِ ناسخ	رشید حسن خاں	۷/۵۰	۶/۵۰
انتخابِ سودا	رشید حسن خاں	۱۱/۵۰	۱۰/۰۰
انتخابِ محمد قلی قطب شاہ	محمد اکبر الدین صدیقی	۵/۵۰	۴/۵۰
انتخابِ ذوق	(ڈاکٹر) تنویر احمد علوی	۴/۲۵	۳/۵۰
انتخابِ مضامینِ سرسید	انور صدیقی	۳/۴۰	۲/۸۰

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز:- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) ۱۵۲۸ پٹودی ہاؤس، دریا گنج، دہلی ۶